جموں و کشمیر میں اردو ادب

(۲۰۰۰ سے ۲۰۱۳)

یاقت علی

بصد خلوص و احترام جناب

سلیم سالک

کی

خدمت میں

ہے

[illegible]

21/8/05

جموں و کشمیر میں اردو ادب

۲۰۰۰ء تا ۲۰۱۳ء

لیاقت علی

کتاب : جموں وکشمیر میں اردو ادب ۲۰۰۰ سے ۲۰۱۳ء تک

مصنف : لیاقت علی

مطبع : ایچ ایس آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی۔

ناشر : ایم۔آر۔پبلی کیشنز

10 میٹروپول مارکیٹ، 2724-25 کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی

Jammu wa Kashmir main Urdu Adab

BY

Liaqat Ali

Email: liaqat.ali393@gmail.com

ISBN: 978-93-86125-46-0

First Edition :2017

Price: ₹ **122/-**

Library Edition: ₹ 255/-

"یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے
نیز شائع شدہ مواد سے کونسل کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے"

Printed & Published by

M. R. Publications

Printers, Publishers, Book Sellers & Distributors of Literary Books

10 Metropole Market, 2724-25 First Floor

Kucha Chelan, Daryaganj, New Delhi-110002

Cell: 09810784549, 09873156910 E-mail: abdus26@hotmail.com

فہرست

ابتدائیہ

جموں وکشمیر ہندوستان کی واحد ایسی ریاست ہے جس کی سرکاری اور عدالتی زبان اردو ہے۔ تین خطوں (جموں، کشمیر، لداخ) پر محیط جموں وکشمیر جغرافیائی، لسانی، تہذیبی اور معاشرتی بنا پر کئی حصوں میں منقسم ہے۔ جموں میں ڈوگری، پہاڑی، گوجری اور پنجابی زبانیں بولی اور سمجھی جاتی ہیں، کشمیر میں کشمیری زبان رائج ہے، لداخ میں لداخی، شینا، بلتی، کوہساتی بولیوں کا چلن عام ہے۔ لیکن ترسیلی ذرائع کے فقدان اور کئی دیگر رکاوٹوں کی وجہ سے یہ زبانیں آپس میں زیادہ میل نہیں کھاتی ہیں۔ ان لسانی مسائل کے حل کے لئے اردو زبان نے ایک پل کا کام کیا ہے اور تینوں خطوں کے باشندوں کے درمیان رابطے کی واحد زبان کا درجہ حاصل کر کے اہل کشمیر کی بقا اور یکجہتی کی ضامن کا درجہ پایا ہے۔ کسی بھی علاقے یا فرقے کی مادری زبان نہ ہونے کے باوجود بھی ایک لسان مشترکہ کے طور گہرے اثر ورسوخ اور ترقی ووسعت کی، اہل کشمیر کی یہ فطری اور ناگزیر ضرورت بھی تھی۔ کیوں کہ فارسی صدیوں درباری اور علمی وادبی زبان کی حیثیت سے راج کرنے کے بعد جب اپنی آنکھیں موند رہی تھی تو اس کی جانشینی کا قرعہ فال اردو پر ہی پڑا اور فارسی نے اپنا تاج اردو کے سر رکھ دیا۔ اردو اور اہل کشمیر کے مابین والہانہ محبت کی گواہی بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق نے جن الفاظ میں دی ہے، ملاحظہ ہو۔

''کشمیر کا حال دیکھ کر مجھے خاص حسرت ہوئی، شاید ہندوستان کے کسی صوبے میں اردو اس قدر مقبول اور رائج نہیں جس قدر کشمیر میں ہے۔۔۔۔ مدارس میں اردو پڑھائی جاتی ہے اور ذریعہ تعلیم اردو ہے۔ دفاتر کی زبان بھی اردو ہے اور بہت اچھے اردو کے ادیب اور شاعر موجود ہیں۔ وہاں کی اسمبلی کے اجلاس کو بھی جا کر دیکھا ہے سب ممبر بلا استثناء اردو میں بلا تکلف تقریریں کرتے تھے۔ یہ سن کر آپ کو تعجب ہوگا کہ پنجاب اسمبلی میں ایسی اچھی اردو کی تقریریں نہیں ہوتی جیسی کشمیر اسمبلی میں ہوتی ہیں''۔

کشمیر میں اُردو زبان کی تشکیل کا عمل مسلم دور حکومت کے قیام اور فارسی داں اولیا کرام کی آمد کے بعد شروع ہوا۔ اہل کشمیر نے غلام در غلام رہنے کے باوجود بھی زبان فارسی میں اپنی ذہانت کا ثبوت دیا۔ برطانوی مفادات کے پیش نظر جب مہاراجہ گلاب سنگھ نے کشمیر کو خرید لیا اور ڈوگرہ حکومت کی بنیاد رکھی تب اہل جموں وکشمیر کا دوسرے لوگوں سے جو رشتہ قائم ہوا، اُس اختلاط نے اردو زبان کے پھلنے پھولنے میں اہم کام کیا۔ ۱۸۸۹ء میں اُردو کو ریاست کی سرکاری زبان کا درجہ دئے جانے کے بعد سے ۱۹۴۷ء تک جموں وکشمیر کے شاعروں اور ادیبوں نے اُردو شعر و ادب کے سرمائے میں ہر لحاظ سے اضافہ کیا اور آج اس ریاست میں اُردو زبان و ادب کی صورت حال بعض خامیوں کے باوجود اتنی ہمہ جہت اور اطمینان بخش ہے کہ جموں وکشمیر کو دہلی، لکھنؤ، لاہور، کراچی، عظیم آباد وغیرہ کی طرح اُردو کا ایک اہم مرکز مانا جاتا ہے۔ سرزمین کشمیر نے ہر دور، ہر عہد میں شعر و ادب کی گوہرِ نایاب شخصیات کو جنم دیا ہے۔ عہد فارسی میں غنیؔ کاشمیری جیسے باکمال شاعر پیدا ہوئے۔ علامہ محمد اقبال جیسے آفاقی شاعر، کرشن

چندر، سعادت حسن منٹو، قدرت اللہ شہاب، رامانند ساگر، چراغ حسن حسرت جیسے نامور نثر نگاروں سے کون بے خبر ہے۔ لیکن سر دست اس کہکشاں کے تعارف کا محل نہیں۔

جموں وکشمیر میں اردو ادب کے حوالے سے اب تک جو کچھ بھی لکھا گیا ہے، اپنے دور کا ترجمان ہے۔ لیکن اکیسویں صدی کی پہلی دہائی کے اردو ادب کا تجزیاتی وتنقیدی جائزہ پیش کرنا ایک نیا کام ہے۔ اس حقیقت کا اعتراف تو اہل ادب کو ہونا ہی چاہیے کہ جموں و کشمیر کی صنعت وحرفت اور تر دماغی سے تو دُنیا واقف ہے لیکن شومیِ قسمت کہ وہاں آج کا نثر نگار اور شاعر گم نامی اور بے اعتنائی کا شکار ہے۔ جس کی وجہ ہم سب سے پوشیدہ نہیں ہے، اول تو سیاسی وسماجی اتھل پتھل اور ساتھ ہی رسل ورسائل اور ذرائع ابلاغ کا فقدان۔ ایسے ماحول میں جب بھی بات ہوتی ہے تو وہ بالعموم حسنِ کشمیر یا ظلمت کشمیر کے گرد گھومتی ہے۔ اس تشنگی کے احساس کے پیشِ نظر میں نے ''جموں وکشمیر میں اردو ادب (۲۰۰۰ء تا ۲۰۱۳ء) کو اپنی طالب علمانہ صلاحیت کے ذریعے پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ تحقیق چونکہ ایک مسلسل عمل ہے جو ہمیشہ ردو بدل کا متقاضی رہتا ہے ساتھ ہی تحقیق ایک مشکل ترین اور تکلیف دہ کام بھی ہوتا ہے جس میں مواد کی تلاش کے لیے دردر کی خاک چھاننی پڑتی ہے، لائبریریوں سے مطلوبہ کتب ورسائل کی عدم دستیابی اور چند لوگوں کے تلخ رویوں تک کے دشوار گذار مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ ممکن ہے اربابِ علم ودانش کے نزدیک اس کام کی بہت اہمیت نہ ہو۔ یہ کسی کہنہ مشق محقق یا نقاد کی نہیں بلکہ ایک طالب علم کی نو آموز کاوش ہے۔ لیکن اس موضوع کی اپنی ماہیت اور انفرادیت ہے کہ متعلقہ دور کے ان موضوعات پر کوئی اطمینان بخش کام ہوا تھا، جن کو اس کتاب میں موضوع بحث بنایا گیا ہے۔

جموں وکشمیر میں اُردو زبان وادب کا آغاز وارتقاء

ریاست جموں وکشمیر اپنے قدرتی حسن، رعنائی اور فطرت کی جادوگری کی بدولت سارے عالم میں مشہور ہی نہیں بلکہ منفرد مقام ومرتبہ بھی رکھتی ہے۔ ماضی میں اور آج بھی یہ رشکِ بریں خطہ اپنوں اور فرنگیوں سبھی کے لیے باعثِ کشش ہے۔ جس نے بھی اس خلد عرضی میں قدم رکھا اس نے اس کی بو اور مسحور کن صورت حال کو قبائے سخن پہنا کر پیش کیا۔ اس قول میں ذرا بھی مبالغہ نہیں کہ یہ زمین سخن وروں کے لئے ایک محبوب موضوع رہی ہے۔ جس نے کئی فلسفوں کو اپنی آغوش میں پروان چڑھا کر دُنیا کو اخوت، محبت اور باہمی شفقت کا درس دیا ہے، شاعروں، ادیبوں اور سیاحوں کی زبان میں کشمیر کو فردوس بریں، خلدِ ارضی، گل پوش وادی، وادی جناں اور جنتِ بے نظیر بھی کہا گیا۔

کشمیر کی مدح سرائی کا سلسلہ دراصل اُس وقت سے شروع ہوا جب ریاست جموں و کشمیر خاص کر کشمیر میں بودھ مت کا دور دورہ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ سنسکرت زبان میں اس حوالے سے کئی منظومات دستیاب ہیں لیکن میں سنسکرت زبان سے نابلد ہوں جس کے لئے معذرت خواہ ہوں کہ مثال کے طور پر کچھ سامنے نہیں رکھ سکتا اور میری ذاتی دانست کے مطاطق اب تک شاید کوئی بھی فن پارہ ترجمہ کی شکل میں منتقل نہیں ہوا ہے۔

تاریخی اعتبار سے کشمیر کے لوگ جب اپنے ہمسایہ ممالک میں جاتے تھے تو وہ وہاں کے روحانی بزرگوں سے کشمیر کے سیاسی اُتھل پتھل اور پریشان شدہ حالات پر توجہ دینے کی درخواست کرتے تھے۔ چنانچہ کشمیر کے لوگوں کی دینی و دنیاوی معاملات کی رہنمائی کے لئے ترکستان کے مشہور صوفی سید اشرف الدین عبدالرحمٰن بلبل اپنے مریدوں اور عقیدت مندوں کے ساتھ ۱۳۳۶ء میں کشمیر تشریف لائے۔ ان دنوں کشمیر کے راجاوں کے آپسی جھگڑوں اور غلط کاریوں کی وجہ سے سارا نظام درہم برہم ہو چکا تھا۔ ان حالات کی وجہ سے آخر کار ہندو راجاؤں کو اقتدار سے ہاتھ دھونا پڑا تھا اور لداخ کا ایک شہزادہ جس کا نام رینچن شاہ تھا کشمیر کا حکمراں بن گیا۔ رینچن شاہ اپنی ہندو بیوی ''کوتہ رانی'' اور وزیروں کے ساتھ بلبل شاہ کے ہاتھوں بیعت ہو کر کے مسلمان ہو گیا۔ بلبل شاہ نے اس کا نام سلطان صدرالدین رینچن شاہ رکھا۔ رینچن شاہ کا ایک وزیر جو خود بھی مسلمان ہو گیا تھا فارسی زبان سے واقف تھا وہ بلبل شاہ سے دین واسلام کی باتیں سن کر اور سیکھ کر مقامی لوگوں میں اسلام کی تبلیغ کیا کرتا تھا۔ اس طرح قرآن و حادیث اور اسلامی تعلیمات کی وجہ سے عام کشمیری لوگ فارسی اور عربی زبانوں سے واقف ہونے لگے۔ حضرت بلبل شاہ کے بعد ۱۳۷۲ء میں ایران کے مشہور صوفی بزرگ امیر کبیر حضرت میر سید علی ہمدانی متعدد عالموں، مبلغوں اور عبادت گذار مریدوں کے ہمراہ کشمیر تشریف لائے، عقیدت اور محبت کی بنا پر شاہ ہمدان کے نام سے مشہور زمانہ ہوئے۔ آپ فارسی کے کہنہ مشق شاعر تھے جن کے اشعار کو تبرک سمجھ کر پڑھا جانے لگا، فارسی زبان سے عام وخاص کو دلچسپی پیدا ہونے لگی اور بحیثیت مسلم قرآنِ پاک کے فارسی ترجمے کو سننے اور پڑھنے کے شیدائی ہونے لگے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہل علم طبقہ فارسی لکھنے اور پڑھنے میں ایک اہم مقام رکھنے لگا۔ سلطان زین العابدین بڈشاہ کے عہد (۱۴۲۰ء تا ۱۴۷۰ء) میں فارسی نے علمی و ادبی زبان کی حیثیت اختیار کرلی۔ بڈشاہ نے سنسکرت کتابوں کے ترجمے فارسی میں کروائے، خود بھی فارسی میں شعر کہتے تھے۔ عبدالاحد آزاد فارسی کے حوالے سے یوں لکھتے ہیں:

''سلطان زین العابدین بڈشاہ کے بعد.... کشمیری زبان کے عروج کی جگہ فارسی زبان نے لے لی۔ فارسی زبان کا عام رواج ہوا تبھی باہر سے کامل الفن شعرا یہاں آئے۔ ان کے فیض واثر سے یہاں بھی (فارسی کے) بڑے بڑے فن کار پیدا ہوئے بعض فصحا نے تو اپنی قابلیت کے وہ جوہر دکھائے کہ فارسی کے اہل زبان تک انگشت بدنداں رہ گئے''۔ [۱]

عبدالقادر سروری نے بھی اپنی کتاب ''کشمیر میں اُردو'' میں لکھا ہے:

''چودہویں صدی میں ایران اور وسط ایشیا سے آنے والے علما کے ساتھ اسلام اور ایرانی تہذیب کشمیر پہنچی اور فارسی زبان کو فروغ ہوا۔ ایک زمانے میں کشمیر پر ایرانی تہذیب کے اثرات اتنے گہرے ہو گئے تھے اور فارسی زبان میں لکھنے والوں کی اتنی کثرت تھی کہ اہل ایران ''کشمیر'' کو ''ایران صغیر'' کہنے لگے تھے''۔ [۲]

فارسی زبان نے اس تیز رفتاری سے عوام الناس میں اپنی جگہ بنائی کے ''شهمیری دور حکومت'' میں سرکاری زبان کا درجہ حاصل کر لیا۔

مذکورہ سطور میں یہ ذکر کیا گیا تھا کہ سید علی ہمدانی فارسی اور عربی کے عالم تھے اور انھوں نے کشمیر میں فارسی زبان وادب کے فروغ میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ آپ نے بیس سے زائد رسالے لکھے ہیں ان میں سے چند نام درج ہیں، جو اب بھی اہم مقام رکھتے ہیں۔

۱۔ رسالہ معرفت زُہد

۲۔ رسالہ اورادیہ

۳۔ رسالہ چهل حدیث

۴۔ رسالہ ذِکریہ

۵۔ رسالہ کشف الحقائق

۶۔ رسالہ مکتوبات

ان رسائل کے علاوہ ان کی مناجات اور غزلیں، مثنویاں اور دیگر شعری تخلیقات بھی شامل ہیں۔ شہمیری حکمرانوں میں سلطان زین العابدین بڈشاہ اور قطب الدین کا الاصل تو کشمیری تھا لیکن عہد دستور کے مطابق مقامی زبان کے بجائے یہ بھی فارسی میں ہی شعر موزوں کرتے تھے۔ شاعری کے علاوہ دینی و تعلیمی مراکز بھی قائم کیے، اپنے درباروں اور درسگاہوں میں علما کو دعوت دی۔ مثلاً سلطان زین العابدین کے دربار میں ملا احمد کشمیری (ملک الشعرا) تھے جنہوں نے دارالترجمہ کے لیے کلہن کی ''راج ترنگنی'' کا فارسی میں ترجمہ ''بحرالاسمار'' کے نام سے کیا تھا۔ آپ کے علاوہ دیگر صوفیا، اُدبا اور شعرا جن میں مرزا حیدر دوغلوت، ملا نامی، بابا طالب اصفہانی، میر علی مولانا مہدی اور مولانا احمد خاص طور پر مشہور ہیں، اپنے دینی، علمی، ادبی اور شعری افکار و خیالات کے اظہار کے لیے فارسی کو وسیلہ بنایا۔ پایے کی بات یہ ہے کہ اس عہد میں مرد ہی کیا کہ خواتین بھی فارسی اور عربی کا شوق رکھتی تھیں۔ عبدالقادر سروری نے اس سلسلے میں لکھا ہے:

> ''سلطان زین العابدین کے بعد حسن شاہ کے عہد میں..... فارسی علم و ادب کا ذوق مردوں سے گذر کر خواتین تک بھی پہنچ گیا تھا۔ چنانچہ حسن شاہ کی ملکہ شاہ بیگم کو بھی علم و ادب سے لگاؤ تھا اور اس نے ایک مدرسہ اشاعت علم کی غرض سے تعمیر کروایا تھا۔ اس کی والدہ گل خاتون کو بھی علم کی اشاعت اور ترقی کا شوق تھا۔ زاہدہ خاتون ایک عارفہ تھیں جن کی اخلاقی کہاوتیں فارسی میں ملتی ہیں''۔ [۳]

شہمیری اور چک حکمرانی کے انحطاط کے بعد جب کشمیر پر مغلوں کا تسلط ہوا تو اکبر اور جہانگیر کے عہد کے سربرآوردہ فارسی شعرا، عرفیؔ، فیضیؔ اور انشاپرداز ابوالفضل کا بھی کشمیر سے تعلق رہا۔ جس عہد میں ہندوستان کے دیگر حصوں میں اردو جوبن پر آرہی تھی اس کے پیش نظر

کشمیر کی سرزمین بھی اردو کی نشو ونما کے لئے ہموار رہی، صرف فارسی ہی نہیں بلکہ عربی زبان نے بھی اردو کے پھلنے پھولنے میں کلیدی کام کیا ہے چونکہ عربی زبان راجہ ہرش کے عہد میں ہی داخل ہو چکی تھی۔ چودھویں صدی سے سولہویں صدی تک اسلام نے اہل کشمیر کو اپنے دائرے میں لے لیا تھا اور آٹھارہویں صدی میں بیرون ریاست سے لوگوں کی آمد ورفت بڑھ گئی تھی۔ اس صدی میں آپسی تعلقات کی بنا پر جموں و کشمیر پنجاب کے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زیر اقتدار میں آ گیا تھا۔ اس دورِ حکومت میں کشمیر کے لوگوں کے حق میں مثبت نتائج ثابت نہیں ہوئے، بہت زیادتیاں ہوئیں جن کے ردعمل میں آئے دن احتجاج اور بغاوتیں ہوئیں، حالات کی تاب نہ لا کر مجبوراً ہجرتیں ہوئیں۔ جن شہروں میں آنا جانا عام تھا ان میں خاص کر لاہور، جالندھر اور امرت سر ہیں۔ جو اس وقت اردو کی ترویج وتالیف کے ادبی مراکز تھے۔ عام لوگوں کے تال میل کی وجہ سے اس وقت کے اردو ادباو شعرا نے بھی کشمیر کے فطری حسن سے اپنے ادب کو حسین موضوعات دینے کے لئے رخ کیا۔ عربی، فارسی اور اردو کی طرح کشمیر کی مقامی زبانیں کشمیری، گوجری، پہاڑی، گریزی اور بلتی بھی دائیں سے بائیں لکھی جاتی ہیں۔ ان زبانوں کی لسانی ساخت اور اِملا ذرا سے فرق کے ساتھ اُردو کی لسانی ساخت اور املا سے مماثلت رکھتا ہے۔ بیرون جموں و کشمیر سے آنے والے لوگ مقامی زبانوں سے ناواقف تھے، رابطے کی غایت دوطرفہ تھی۔ اس مقام پر سامنے اردو زبان موجود تھی اہل جموں و کشمیر والوں کو اردو زبان سے دلچسپی بھی تھی تو انھوں نے نہ صرف اردو زبان اختیار کی بلکہ اس کے پھیلانے میں اہم کردار بھی نبھایا۔ جس کی وجہ سے اتنے محیط عرصے میں ہی اردو مضبوط اور مستحکم حیثیت حاصل کر گئی۔ جموں و کشمیر کے نظم ونسق میں اُتھل پتھل اور بگاڑ کے سبب سے مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنی حکمرانی کی باگ ڈور بہادر ڈوگرہ افسر گلاب سنگھ کو سونپ دی تھی۔ گلاب سنگھ نے صرف سیاسی مصلحتوں اور کاروباری ضرورتوں کے تحت دہلی اور لاہور کی حکومتوں کے ساتھ تعلقات ہی قائم نہیں کیے بلکہ اپنے دربار میں مختلف علوم وفنون میں مہارت رکھنے والے غیر ریاستی ماہرین اور

افسران کو بھی ملازم رکھا جو اُردو داں تھے۔ اس بات کی تصدیق ڈاکٹر برج پریمی کے اس اقتباس سے بھی ہوتی ہے:

''ڈوگرہ عہد میں کچھ عرصہ تک ''نقیبوں'' کو ہندوستان کے مختلف شہروں سے بلا کر اپنے دربار میں اس غرض کے لئے تعینات کیا گیا تھا کہ وہ ڈوگرہ دربار میں مغلئی جاہ و جلال کا سا انداز پیدا کریں۔ چنانچہ جب مہاراجہ دربار میں آتا تھا تو اس کی آمد کا اعلان مغلئی (مغل بادشاہوں کے) انداز سے کیا جاتا تھا۔ ان نقیبوں کے ساتھ ان کے پورے پورے خاندان بھی ہوتے تھے جن کی بول چال اُردو تھی۔ اس طرح سے بھی اُردو زبان کا جموں وکشمیر میں عمل دخل شروع ہوا''۔[۶]

مہاراجہ گلاب سنگھ کے سامنے مغلیہ حکومت کا نقشہ تھا جس کا اتباع کرنا راجا کے لئے باعث فخر تھا۔ فارسی کو درباری زبان کا درجہ دینا، مغلوں کے رسوم و رواج اور تہواروں کو ویسے ہی منانا، دربار سجانا اس بات کی دلیل ہے۔ ان موقعوں پر بیرونِ ریاست کے فنکاروں، گانے بجانے والوں، رقاص و بازیگروں کو دعوت شرکت دیتے تھے جو اردو زبان بولتے تھے اور باہم تبادلہ خیال بھی اردو میں ہی کرتے تھے۔ گلاب سنگھ کے عہد حکمرانی میں زیادہ تر افسران اُردو سے نہ صرف آشنا تھے بلکہ دفتری کام فارسی کے ساتھ ساتھ اُردو میں بھی کرتے تھے۔ لاہور چونکہ اردو کا ایک مرکز تھا کے علاوہ ہندوستان کے دیگر حصوں سے اخبارات و رسائل جموں وکشمیر میں پہنچتے تھے۔ جموں وکشمیر کے نو آموز اُردو شعرا و ادبا کی تخلیقات کے شائع ہونے کا ذریعہ بھی یہ ہی اخبارات و رسائل بنے۔ ہندوستان کے دیگر شہروں میں تھیٹریکل کمپنیوں کا چلن عام تھا تو گلاب سنگھ نے بھی ان کمپنیوں کو جموں وکشمیر میں ڈرامے پیش کرنے کے لئے اجازت دی، کمپنیوں نے گلی گلی میں جا کر اپنے ڈرامے پیش کئے۔ لوگ نہ صرف ان کے قریب ہوئے بلکہ ڈرامے دیکھنے کا ذوق و شوق بھی رکھتے تھے۔ قوالی گانے کا رواج بھی عام ہونے لگا تو لوگ

بے ساختگی میں اشعار گنگناتے تھے۔ اہم بات یہ کہ اس وقت فورٹ ولیم کالج (۱۸۰۰) اور دلی کالج (۱۸۲۷) میں بہت سارا ترجمہ شدا مواد بھی جموں وکشمیر میں پہنچا۔ جس سے تعلیم یافتہ طبقہ میر وغالب کی شاعری اور میر امن اور رجب علی بیگ سرور کی نثر سے بھی واقف ہوئے۔ بالآخر ۱۶ مارچ ۱۸۴۶ء میں برطانوی حکومت کے زیر اثر آکر گلاب سنگھ نے جموں وکشمیر کو ۷۵ لاکھ کے عوض خرید لیا تھا۔ جس کا اظہار علامہ اقبال نے اپنی شاعری میں یوں کیا ہے:

اے باد صبا گر بہ جینوا گذر کنی
حرفے زمابہ مجلس اقوام بباز گوئے
دہقاں وِ کشت و جوئے و خیاباں فروختند
قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند

علامہ اقبال کا تو تعلق ہی اسی سرزمین سے تھا تو اس سودے سے فطری متاثر ہونا ان کے لئے بجا بھی تھا لیکن اردو ادب کے دیگر شعرا بھی متاثر نظر آتے ہیں۔ حفیظ جالندھری اس طرح اظہار کرتے ہیں:

لوٹ لی انسان کی قسمت پچھتر لاکھ میں
بک گئی کشمیر کی جنت پچھتر لاکھ میں
مرد کا سرمایہ محنت پچھتر لاکھ میں
عورتوں کا جوہر عصمت پچھتر لاکھ میں ۵

گلاب سنگھ نے حکومت سے دست برداری کے بعد ۱۸۵۶ء میں مہاراجہ رنبیر سنگھ کو حکومت سونپ دی۔ رنبیر سنگھ (۱۸۵۷ء تا ۱۸۸۵ء) کے دور میں گرچہ سرکاری زبان فارسی ہی رہی لیکن اس دور میں اُردو زبان نے اپنے قدم مظبوط کئے۔ آپ ایک علم دوست حکمران تھے، اپنے عہد حکمرانی میں انتظامی معلومات کے لئے شیر سنگھ مہتہ سے اردو زبان میں رپورٹیں تیار کروائیں، اس کے علاوہ جب شیر سنگھ مہتہ نے بلخ کا سفر کیا تو واپس آکر اپنا سفر نامہ اردو میں

ہی لکھا بقول برج پریمی:

''چودھری مہتہ شیر سنگھ نے ۱۸۶۴ء تا ۱۸۶۶ء کے دوران بخارا کا سفر کیا۔ واپسی پر اس نے اُردو میں اپنا سفر نامہ قلم بند کیا۔ یہ ریاست میں سرکاری طور پر پہلی اُردو تحریر تسلیم کی گئی ہے۔ صفحات پر مشتمل یہ سفر نامہ بڑا دِلچسپ ہے''۔ ۷

لیکن شیر سنگھ مہتہ نے سفر نامہ کے علاوہ بھی اور کئی کتابیں اُردو میں لکھیں جو اس طرح ہیں۔

۱۔ احوال ملک لداخ: یہ کتاب ۱۸۶۹ء میں مکمل ہوئی جس میں لداخ کے لوگوں کے سماجی وتہذیبی حالات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

۲۔ ترجمہ بھگوت گیتا

۳۔ ترجمہ۔ تاریخ انگلستان

رنبیر سنگھ کے زمانے میں اُردو عوامی رابطے کی زبان Lingua Franca بن چکی تھی لہٰذا اُردو کی علمی ادبی اور انتظامی افادیت کے پیش نظر ریاست میں اُردو کو ذریعہ تعلیم بنادیا گیا تھا۔ کشمیر کے ایک مشہور شاعر قیصر قلندر نے ''کشمیر میں اُردو'' کے عنوان سے اپنے مضمون (مطبوعہ شاعر بمبئی ۱۹۶۱ء) میں اس بات کی تصدیق کی ہے کہ۔

''مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد حکومت سے آج تک اُردو زبان اسکولوں میں ذریعہ تعلیم رہی ہے''۔ ۸

مہاراجہ رنبیر سنگھ نے سنسکرت کالج، ایک لائبریری (رنبیر لائبریری) اور دارالترجمہ قائم کیا۔ ان میں ''دارلترجمہ'' نے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ عبدالقادر سروری کے بقول:

''اس دارالترجمہ کے ناظم پنڈت گنیش کول مقرر ہوئے تھے۔ دارالترجمہ کے انتظام کے بارے میں اب تک کوئی تفصیلات دستیاب نہیں ہوئیں۔ اتفاق سے حکومت کی نظم ونسق کی ایک رپورٹ میں، جو ۱۸۸۲ء اور

۱۸۸۳ء میں لکھی گئی ہے ایک اندراج ملتا ہے جس سے اس کے ایک سال کے اخراجات سے ترجمہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ ۴۵۰۲ روپیہ اجرت ترجمہ پر اس سال صرف ہوا اور سال حال میں کوئی کتاب جو انگریزی سے شاستر اور شاستری سے بھاشا اور عربی سے اُردو میں ترجمہ ہوئی ہیں ختم نہیں ہوئی ہیں لہٰذا اُن کی تفصیلی رپورٹ سال آئندہ میں درج ہوگی''۔۹

جب یہ ادارہ بند ہوگیا تو سارہ ادبی سرمایہ ریسرچ لائبریری سرینگر میں شفٹ کیا گیا۔ انتظامیہ کی عدم دلچسپی سے متعدد مخطوطے اِدھر اُدھر ہو گئے ہیں، جو موجود ہیں انھیں اب اقبال لائبریری (کشمیر یونیورسٹی) میں منتقل کیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ رنبیر سنگھ نے ''بدیا بلاس پریس'' کے نام سے ایک چھاپہ خانہ بھی قائم کیا، جس سے دارالترجمہ میں ترجمہ شدہ کئی کتابیں شائع کی گئیں۔ ان کتابوں کے تراجم اور مسودوں کی تیاری میں غلام غوث خان، پنڈت بخشی رام، مولوی فضل الدین، لالہ بسنت رائے وغیرہ اسمائے گرامی اہم ہیں۔ ۱۸۸۵ء میں جب مہاراجہ رنبیر سنگھ فوت ہو گئے تو مہاراجہ پرتاب سنگھ ان کے جائے نشیں ہوئے۔ ان کے عہد تک فارسی ہی سرکاری زبان تھی لیکن مہاراجہ پرتاب سنگھ نے اپنے دورِ حکومت میں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیا جس کے صحیح سال تاریخ کا اختلاف ہے۔ محمد یوسف ٹینگ (۱۸۸۵ء)، برج پریمی (۱۸۸۹ء)، بلدیو پرشاد اپنے ایک مضمون (مطبوعہ شیرازہ (۱۹۸۸ء) میں ۱۸۸۶ لکھتے ہیں۔

پرتاب سنگھ نے عیسائیت تبلیغ کے ردعمل میں ''سناتن دھرم سبھا'' قائم کی تو سالک رام سالگ نے کئی کتابچے لکھے جو حسب ذیل ہیں۔

۱۔ مورتی منڈن

۲۔ دھرم اُپدیش

۳۔ ارتھ شاشتر

۴۔لغت اُردو

۵۔محاورات اُردو

۶۔داستان جگت روپ وغیرہ۔

سالک رام سالک کے بڑے بھائی پنڈت ہر گوپال خستہ جو ہجرت کر کے لاہور چلے گئے تھے اور کتاب ''گلدستہ کشمیر'' لکھی جس کو پروفیسر قدوس جاید نے اپنے ایک مضمون (مطبوعہ اردو دنیا، دہلی ۲۰۱۲ء) میں جموں وکشمیر کی پہلی نثری تصنیف قرار دیا۔اس کے علاوہ ہرگوپال کول خستہ نے ڈپٹی نذیر احمد کے ناول ''مراۃ العروس'' کے تتبع میں ایک قصہ ''گلزار فواعد بھی لکھا۔

اس دور حکومت (ڈوگرہ حکومت) میں پریس قائم کرنے اور اخبار ورسائل جاری کرنے کی پابندی تھی۔تو اہل کشمیر بیرونِ کشمیر کے دوسرے شہروں سے اخبارات ورسائل جاری کرتے تھے۔جن میں ''اخبار عام''، ''خیر خواہ کشمیر''، ''ہمدرد ہند''، ''کشمیری گزٹ''، ''کشمیری میگزین''، ''کشمیری مخزن''، ''صبح کشمیر''، ''بہار کشمیر'' اور ''پنجہ فولاد'' وغیرہ اہم ہیں۔لیکن بیسویں صدی میں جموں وکشمیر سے ڈوگرہ حکومت کی اجازت کے مطابق پہلا اخبار ''رنبیر'' ۱۹۲۴ء میں جاری ہوا جس کے اڈیٹر ملک راج صراف تھے۔ اس کے بعد کشمیر سے ''وتستا''، ''ہمدرد''، ''صداقت''، ''مارتنڈ''، ''وکیل''، ''حقیقت''، ''خالد'' اور ''خدمت'' وغیرہ اخبارات شائع ہوتے رہے۔جن میں مقامی ادباء وشعرا کی تخلیقات کو شائع کیا جاتا تھا۔۱۹۴۷ء کی تقسیم اور آزادی کے بعد متعدد اخبارات اور رسائل کا سلسلہ جاری ہوا جو آج بھی برقرار ہے۔آج کی تاریخ میں جموں وکشمیر سے ''شیرازہ''، ''حکیم الامت''، ''تعمیر''، ''بزم ادب'' اور ''تفہیم'' وغیرہ ادبی رسالے شائع ہو رہے ہیں اور ''آفتاب''، ''کشمیر عظمیٰ''، ''اطلاعات''، ''اُڑان''، ''سرینگر ٹائمز''، ''تسکین''، ''ہندوستان چٹان'' وغیرہ سینکڑوں روزنامے اور ہفتہ وار اخبارات

شائع ہورہے ہیں۔ان اخباروں میں ادبی تخلیقات، تحقیقی وتنقیدی مضامین، کالم وغیرہ بھی شائع ہوتے ہیں۔ حامدی کاشمیری، محمد یوسف ٹینگ پروفیسر ظہو الدین، عرش صہبائی، سلطان الحق شہیدی، ہمدم کاشمیری، رفیق راز، مظفر ایرج، شبیب رضوی کے علاوہ سینکڑوں شاعر و ادیب اپنی نگارشات کے ذریعے ریاست جموں و کشمیر میں اُردو زبان اور شعر و ادب کو پروان چڑھانے میں مصروف ہیں۔اور چونکہ اُردو ریاست کی سرکاری، درباری، دفتری اور کاروباری زبان بھی ہے اور ذریعہ تعلیم بھی ہے۔ پوری ریاست میں ہزاروں اسکولوں اور کالجوں میں اور جموں وکشمیر کی یونیورسٹوں میں اُردو تعلیم کا انتظام ہے۔ کشمیر، جموں اور لیہہ لداخ میں ریڈیو اسٹیشن ہیں، ٹیلی ویژن سینٹر ہیں، جن سے اُردو پروگرام نشر کیئے جاتے ہیں۔

دیکھا جائے تو اُردو زبان و ادب نے ڈیڑھ دوسو برسوں میں ہی ریاست جموں و کشمیر میں اتنی ہی ترقی کر لی ہے جتنی کہ برصغیر ہند کے دوسرے ادبی مراکز لاہور، حیدرآباد، دہلی، لکھنؤ وغیرہ میں اُردو زبان وادب نے کم وبیش ایک ہزار سال میں کی ہے۔اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ جموں و کشمیر میں اُردو زبان وادب کے فروغ وارتقا کے لیے ہندوستان کے تمام ادبی مراکز اور اداروں میں اُردو زبان کی ساخت، اسالیب، اضاف، مزاج اور معیار کے نثر نگاروں نے پورا پورا فائدہ اُٹھایا اسی لیے جموں وکشمیر میں اُردو زبان وادب کے ارتقا کی رفتار تیز رہی۔ریاست جموں وکشمیر میں اُردو کو بعض مسائل کا سامنا ضرور ہے لیکن اِس ریاست میں اُردو کی جڑیں اتنی مضبوط ہیں کہ جموں وکشمیر میں اُردو کا مستقبل شاندار اور محفوظ ہی نظر آتا ہے۔

کشمیر میں اُردو شاعری کا آغاز اُن کشمیری النسل فارسی شعرا کے ہاتھوں ہوا تھا۔ جو اپنے علم وفضل کی بنا پر مغل درباروں سے وابستہ تھے۔ان شعرا میں ملا محسن فانیؔ، رسواؔ، قبول اور حشمتؔ وغیرہ کا ذکر گذشتہ صفحات پر کیا جاچکا ہے۔البتہ کشمیر (متحدہ) میں ہی سکونت پذیر جن شعرا نے کشمیر میں اُردو شاعری کی داغ بیل ڈالی ان میں شیخ غلام محی الدین کو اولیت حاصل ہے ان کی ۱۷۷۱ء کی لکھی ہوئی مثنوی ''گلزار فقیر'' کشمیر کی پہلی شعری تخلیق مانی جاتی ہے۔اُردو نثر

کے آغاز وارتقا کے حوالے سے لالہ بوٹا مل، پنڈت ہرگوپال خستہ اور چودھری شیر سنگھ مہتہ کی نثری تحریروں کا ذکر آتا ہے۔ لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا جموں میں اردو کی ابتدائی ترقی زیادہ ہوئی یا پھر کشمیر میں تو اعتراف یہ کرنا پڑتا ہے کہ جموں میں اردو کو ترقی کرنے کے مواقع زیادہ ملے۔ اُردو نثر کے آغاز وارتقا کا تحقیقی جائزہ تفصیل چاہتا ہے اور یہ جائزہ شمالی ہند میں اُردو نثر کے آغاز وارتقا کے حوالے سے ہی لیا جانا مناسب ہوگا۔ کیونکہ شمالی ریاستوں میں اُردو نثر کے ارتقا کے بعد ہی جموں وکشمیر میں اُردو نثر کا آغاز ہوتا ہے اور دیگر ریاستوں میں سترہویں اٹھارہویں صدی میں اُردو شاعری کے ساتھ ساتھ اُردو نثر بھی ترقی کی منزلیں بڑی تیزی سے طے کرتی رہی تھی۔ فورٹ ولیم کالج (قیام ۱۰ جولائی ۱۸۰۰ء) میں مختلف موضوعات پر تصنیف وتالیف اور ترجمہ کا کام بڑے پیمانے پر ہو چکا تھا۔ اور اُردو نثر کے ارتقا میں برق رفتاری آچکی تھی۔ میرامن کی ''باغ و بہار'' اور حیدر بخش حیدری کی ''آرائش محفل'' فورٹ ولیم کالج کے شاہکار کارنامے ہیں۔ بعض اسباب کی بنا پر ۱۸۲۰ء میں فورٹ ولیم کالج بند ہو گیا لیکن سات سال کے بعد ۱۸۲۷ء میں ہندوستانیوں کو انگریزی علوم وفنون اور تہذیب وتمدن سے آشنا کرنے کے لیے دلی کالج کا قیام عمل لایا گیا۔ دلی کالج میں اُردو نثر میں مختلف موضوعات پر مضامین اور کتابیں لکھوانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ حالیؔ، محمد حسین آزادؔ، ڈپٹی نذیر احمد اور منشی ذکاء اللہ کی تربیت دلی کالج میں ہی ہوئی تھی جن کا شمار اُردو کے چوٹی کے نثر نگاروں میں ہوتا ہے۔ دلی کالج نے اُردو صحافت کو بھی فروغ دیا۔ ۱۸۴۲ء میں دلی کالج میں ایک شعبہ ترجمے کا بھی قائم کیا گیا تھا جس کا نام Vernacular Translation Society تھا۔ اس شعبہ کے تحت مختلف علوم وفنون سے متعلق جدید وقدیم سینکڑوں انگریزی، عربی، فارسی اور سنسکرت کی کتابوں کا اُردو نثر میں ترجمہ کیا گیا۔ دلی کالج کے ماسٹر رام چندر اور منشی ذکاء اللہ وغیرہ نے علم ہیئت، علم ریاضی اور دیگر موضوعات پر لکھی گئی انگریزی، فارسی کتابوں کے ترجمے کئے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد سرسید تحریک کے تحت خود سرسید اور ان کے رفقائے کار، حالیؔ، شبلی مولوی چراغ علی، منشی سجاد

حسین، کرامت حسین وغیرہ اُردو نثر کو ارتقاء کی بلندیوں پر پہنچا چکے تھے۔ اس عہد میں ریاست جموں وکشمیر کے مہاراجہ رنبیر سنگھ (۱۸۵۷ء تا ۱۸۸۵ء) نہ صرف خود تعلیم یافتہ تھے بلکہ انگریزوں کے ساتھ ان کے اچھے تعلقات بھی تھے انہیں ہندوستان کے سیاسی حالات کے ساتھ ہی لسانی صورت حال کا بھی اندازہ تھا۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ ریاست جموں وکشمیر کے لوگوں کو بھی تعلیم یافتہ اور جدید علوم وفنون سے آشنا کروانے کے خواہش مند تھے۔ قیاس ہے کہ وہ فورٹ ولیم کالج اور دلی کالج کے علمی و ادبی کارناموں سے بھی واقف تھے۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ کا وزیر عظیم دیوان کرپارام کئی فارسی کتابوں کا مصنف تھا اور انگریزی کے علاوہ اُردو زبان میں بھی دسترس رکھتا تھا۔ دیوان کرپارام نے ہی ریاست کی انتظامی صورت حال کے بارے میں اُردو میں رپورٹیں تیار کروائیں اور ان کی اشاعت کا اہتمام بھی کیا۔ ان رپورٹوں کو ہی ریاست میں اُردو کے ابتدائی نثری نمونے کہا جاتا رہا ہے۔ لیکن جدید تحقیق کے مطابق، ''گلاب سنگھ کے عہد کے خاتمے سے پہلے بوٹا مل نامی ایک شخص نے ''چائے کی کاشت'' کے بارے میں ایک رسالہ ۱۸۵۷ء میں اُردو میں لکھا تھا جو اُردو کی پہلی نثری تحریر قرار دی جاسکتی ہے۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ نے سرکاری رپورٹوں اور کتابوں کی اشاعت کے لیے ۱۸۸۲ء میں ''بدیا بلاس'' کے نام سے ایک پریس قائم کیا، اسی نام سے پہلا اخبار سرکاری گزٹ کے طور پر جاری کیا گیا جو اُردو اور دیوناگری زبانوں میں شائع ہوتا تھا۔ یہ اخبار اردو کی ترقی وترویج کے لئے ایک اہم قدم تھا۔ بدیا بلاس پریس کے مالکان پنڈت بنکٹ رام شاستری اور پنڈت کھوجو شاہ تھے اور اخبار کے مدیر گوپی ناتھ گرٹو تھے یہ اخبار ہندی اور اُردو میں نکلتا تھا۔ ''اختر الدولہ ستیاپوری''، ''اختر شہنشاہی'' میں اخبار ''بدیا بلاس'' کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''بدیا بلاس، جموں، ریاست کشمیر، ہفتہ وار، آٹھ ورق اوسط، یوم (اشاعت) شنبہ (اُردو) ناگری مشترق، قیمت (سالانہ) بارہ روپئے، مالک پنڈت بنکٹ رام شاستری، مہتمم کھوجو شاہ، مطبع بدیا بلاس۔

اجراء ۱۸۶۷ء"۔ ۱۰

اُدھر سرکاری دارالترجمہ کے توسط سے سنسکرت اور فارسی میں ترجمہ شدہ کئی کتابیں شائع ہوئیں اور کئی کتابیں سنسکرت اور عربی فارسی سے اُردو ہندی میں ترجمہ کروائی گئیں۔ اس عہد کے کئی مسودات رنبیر لائبریری جموں میں موجود ہیں۔ ان مسوادت کی تیاری میں غلام غوث خاں، پنڈت بخشی رام، مولوی فضل الدین، لالہ بسنت رائے وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ ان حضرت نے فن طب انجینئر نگ، منطق، تاریخ، مذہبیات، کاغذ سازی اور اناٹومی Anatomy جیسے موضوعات پر مسودات تیار کئے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد (۱۸۵۷ء تا ۱۸۸۸ء) تک اُردو ریاست جموں وکشمیر کی عوامی زبان کی حیثیت حاصل کر چکی تھی چنانچہ رنبیر سنگھ کے ایک عہدہ دار چودھری شیر سنگھ نے ۶۵ ۱۹۶۴ء کے دوران بخارا اور سمرقند وغیرہ کا سفر کیا اور واپسی پر اس نے اپنا سفرنامہ اُردو میں ہی تحریر کیا۔ اس سفرنامہ کا شمار ریاست کی ابتدائی اُردو نثری تحریروں میں کیا جاتا ہے۔ ۱۵۰ صفحات پر مشتمل یہ سفرنامہ معلوماتی بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ ۱۸۸۵ء میں فوت ہو گیا اور مہاراجہ پرتاب سنگھ تخت نشین ہوئے اس وقت تک اُردو زبان لنگوافرینکا بن چکی تھی چنانچہ پرتاب سنگھ نے اُردو کی مقبولیت اور عوامی اور دفتری ضروریات کے پیش نظر ۱۸۸۹ء میں اُردو کو ریاست کی سرکاری زبان کے منصب پر فائز کر دیا۔ پرتاپ سنگھ کے عہد کے اُردو ادیبوں میں نثر کے حوالے سے پنڈت ہر گوپال خستہ کا نام سرفہرست ہے۔ جن کا ذکر گذشتہ صفحات پر کیا جا چکا ہے۔ لیکن چونکہ خستہ کشمیر میں اُردو زبان وادب کے بنیاد گذاروں میں سے ایک ہیں۔ اس لیے ان کی ادبی کاوشوں کے بارے میں جاننا ضروری ہے۔

ہر گوپال خستہ کشمیر الاصل تھے۔ ملازمت کے حوالے سے خستہ کو لاہور، پٹیالہ اور شملہ میں رہنے کا موقع ملا۔ پنڈت ہر گوپال نے اپنا تخلص ''خستہ'' غالب کے شاگرد مرزا تفتہ کے اتباع میں اختیار کیا تھا۔ ان کے پردادا پنڈت گواشہ کول سکھ دور میں کشمیر سے پنجاب چلے

گئے تھے خستہ کے دادا پنڈت مہادیو کا شمار بھی شرفا میں ہوتا تھا۔ والد پنڈت رام چندر کول شیو فلسفہ کے جانے مانے عالم تھے۔ جن دنوں خستہ لاہور میں تھے ان کا رابطہ پنجاب کے ڈائریکٹر تعلیمات کرنل ہالرائڈ سے ہوا۔ گلدستہ کشمیر کی اشاعت میں کرنل ہالرائڈ کے تعاون کا اعتراف خستہ نے مذکورہ تصنیف کے آخیر میں ''خاتمۃ الکتاب'' کے عنوان سے مختلف افراد کا شکریہ ادا ان الفاظ میں کیا ہے۔

> ''گلدستہ کشمیر، بہ نظر فیض اثر قدر دان اہل علم و ہنر، فیض رساں....سخن پرور، فاصل اجل عالم اکمل، امیر دریا دِل جناب فضلیت ماب، لفٹنٹ کرنل ڈبلیوایم ہالرائڈ صاحب، ڈائریکٹر سرشتہ تعلیم پنجاب کی مدد سے زیور طبع سے آراستہ و پیراستہ ہوئی''۔ [۱۱]

کرنل ہالرائڈ اُردو دوست انگریز افسر تھے انھیں کی ایما پر محمد حسین آزاد نے ۱۵ اگست ۱۸۶۷ء میں لاہور میں انجمن پنجاب قائم کی تھی۔ پروفیسر عبدالقادر سروری اور پروفیسر حامدی کاشمیری نے انجمن پنجاب کے قیام کا سال ۱۸۶۷ء ہی بتایا ہے لیکن بعض لوگوں نے ۸ مئی ۱۸۶۴ء کو ہونے والے انجمن کے پہلے اجلاس کو ہی اس کی تاریخ قرار دیا ہے۔ انجمن کا جو (پہلا بڑا) اجلاس ہوا اس میں کرنل ہالرائڈ، مسٹر تھارنٹن سکریٹری پنجاب گورنمنٹ، کرنل میکلاگن اور مسٹر مینگ وغیرہ انگریز افسران کے علاوہ اُردو کے قلم کاروں میں صرف مولوی سید احمد (مصنف فرہنگ آصفیہ) مولوی کریم الدین (مصنف خط تقدیر) رائے بہادر پیارے لال آشوب، منشی درگا پرشاد نادر، پنڈت من پھول، نواب عبدالمجید خاں اور فقیر سید قمرالدین کے نام دیے گئے ہیں۔ پنڈت ہرگوپال خستہ اُن دنوں لاہور میں ہی تھے لیکن انجمن پنجاب کے مذکورہ اجلاس میں شرکت کی تھی یا نہیں اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ البتہ ڈاکٹر برج پریمی نے لکھا ہے کہ ''قیام لاہور کے دوران وہ (خستہ) راوی ریفارمر، خیر خواہ کشمیر'' اور ''دیش کی پکار'' جیسے اخبارات ورسائل سے وابستہ رہ چکے تھے....وہ انجمن کی کارکردگیوں اور اس عہد کے نئے

خیالات وتصورات سے واقف تھے۔ اس زمانے میں سرسید تحریک کے زیر اثر اُردو میں تعمیری شاعری کے ساتھ ساتھ نثر میں تاریخ، جغرافیہ، سوانح عمری، تنقید و تحقیق، سائنس، زراعت اور فلسفہ جیسے موضوعات کو ترجیح دینے کا رجحان عام ہو چکا تھا۔ مقصد عوام میں روشن خیالی پیدا کرنا تھا۔ اس مقصد کے تحت سوامی دیانند سرسوتی نے بھی ۱۹۷۵ء میں آریہ سماجی تحریک، شروع کی تھی۔ چنانچہ ان دونوں تحریکات نے ہندوستانی معاشرت، ثقافت اور شعر وادب میں جو جدید رجحانات پیدا کیے اس کا اندازہ اس زمانے کے اُردو، ہندی اور بنگلہ شعر وادب سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اسی جدید ادبی وثقافتی صورت حال میں کشمیر کے اُردو ادیب ہر گوپال خستہ نے بھی جغرافیہ، تاریخ، سوانح عمری اور اصلاحی قصہ نویسی کی جانب توجہ دی حالانکہ بقول مرتب ''بہار گلشن کشمیر''، خستہ بنیادی طور پر شاعر تھے۔ ان کی شاعری کا ذکر پروفیسر عبدالقادر سروری نے اپنے ایک مضمون مطبوعہ ''نیا دور'' لکھنؤ ۱۹۶۵ء میں کیا ہے۔ لیکن خستہ نے تقاضائے وقت کے مطابق نثر نگاری کو اپنا شعار بنایا۔ اپنی نثری تصنیفات کے بارے میں پنڈت ہر گوپال خستہ نے ''گلدستہ کشمیر'' کے دیباچے میں خود لکھا ہے۔

> ''۱۹۳۱ء بکرمی (مطابق ۱۸۷۴ء) میں اس ناچیز نے ایک مختصر جغرافیہ کشمیر کا لکھا تھا جو کہ مطبع بہار کشمیر لکھنؤ میں چھپا تھا اس کے نا مکتفی ہونے کے باعث دل کو یہ شوق پیدا ہوا کہ 'تواریخ کشمیر' زبان اُردو میں جو کہ فی زمانہ مروج اور زود فہم ہے، بشمول جغرافیہ کشمیر جواب تک ہندوستانی زبانوں یا فارسی میں کسی نے نہیں لکھا، ایسا تیار کروں جس کے پڑھنے سے ناظرین کو سطح کشمیر کا حال اس طرح پر معلوم ہو سکے گویا وہ کشمیر میں پھر کر سیر کر رہے ہیں۔ اسی غرض سے بامداد پنڈت دامودر صاحب (جو اس وقت فضیلت ولیاقت کے باعث سپہر علم سنسکرت کے آفتاب ہیں) کتاب لاجواب راج ترنگنی مصنفہ کلہن پنڈت، کو جو کہ معتبر

اور پرانی تواریخ کشمیر نارائن کول اور بیر بل کاچرو و مرزا حیدر و گلزار کشمیر وسفر نامہ داین صاحب و مور کرافٹ صاحب سانسز گائڈ جموں و کشمیر مصنفہ ڈریو صاحب و ناردرن باریرو تاریخ فرشتہ، وغیرہ کتب از سرتا پا دیکھا اور بعض ضروری مقامات ''نیل مت پران'' و ''شارکا مہاتم''، وتستا مہاتم وسوئم مہاتم کو پنڈت صاحب موصوف کی زبانی بخوبی سنا، بہت سے اطراف واکناف کو بچشم خود دیکھا اور محسن آدمیوں سے بہت سی باتیں تحقیق کیں اور ۱۸۳۴ء بکرمی (۱۸۷۷ء) میں بڑی احتیاط کے ساتھ بلا مبالغہ بہ ترک فضول نسخہ، ہذا لکھ کر تین حصوں میں تقسیم کیا اور نام ''گلدستہ کشمیر'' رکھا۔ باقی احوال مفصل اس عبودیت کا کتب مولفہ بندہ گوپاہ نامہ 'چہار گلزار'، شگفتہ بہار'، مخزن خستہ، معروف بہ، ''گل بہار' 'سوانح عمری خستہ وغیرہ میں درج ہیں'' ۔۱۲

''گلدستہ کشمیر'' کے دیباچے سے ماخوذ اس اقتباس سے کئی اہم باتیں سامنے آتی ہیں۔

۱ اس زمانے (۱۸۷۳ء) کے آس پاس اُردو دوسری زبانوں کے مقابلے میں زیادہ ''مروج'' اور زود فہم زبان تھی۔

۲۔ ''گلدستہ کشمیر''، محض تاریخ نہیں بلکہ کشمیر کی جغرافیائی تاریخ ہے۔اس اعتبار سے یہ ایک منفرد تصنیف ہے۔Geography of Jammu and Kashmir کے نام سے پروفیسر ماجد حسین نے ۱۹۸۵ء میں جو کتاب ترتیب دی ہے اس کے اکثر مضامین سے گلدستہ کشمیر میں فراہم کردہ معلومات کی تصدیق ہوتی ہے۔

۳۔ خستہ نے گلدستہ کشمیر لکھتے ہوئے اس وقت تک دستیاب کشمیر کی تمام اہم تاریخی کتابوں سفر ناموں اور رپورٹوں سے استفادہ کیا ہے۔گرچہ خستہ نے اپنے دیباچے میں اس کا

اعتراف نہیں کیا ہے۔ لیکن گلدستہ کشمیر میں فریڈرک ڈریو (Fredric Dreu) کی کتاب Jammu and Kashmir Terretoria (مطبوعہ ۱۸۵۷ء) میں جموں وکشمیر کے جغرافیہ آب وہوا، موسم، کوہ بیاباں، جھلیوں اور چشموں سے لے کر ریاست کی مختلف قوموں اور ان کے رسوم ورواج تہوار اور اہل کشمیر کے مزاج، فطرت اور خط وخال وغیرہ کے بارے میں جو تفصیلات بیان کی ہیں کہا جاسکتا ہے کہ خستہ نے ان سے خوب خوب استفادہ کیا ہے۔ لیکن چونکہ یہ تفصیلات عمومی ہیں اور اکثر وبیشتر مورخین نے ان کا ذکر کیا ہے اس لیے اسے سرقہ تو نہیں کہا جاسکتا البتہ اظہار وبیان میں مبالغہ اور تعصب کے عناصر کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔

۴۔ خستہ نے راج ترنگنی کو معتبر تواریخ کشمیر قرار دیا ہے جب کہ کئی دانشوروں نے راج ترنگنی کو تصورات اور مفروضات پر مبنی افسانوی تاریخ بھی قرار دیا ہے۔

۵۔ عام طور پر گوپال خستہ کی اُردو تصنیف کے طور پر صرف گلدستہ کشمیر کا نام لیا جاتا ہے۔ لیکن خستہ کے مذکورہ بالا اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تصنیفات کئی ہیں۔ مثلاً

۱۔ مختصر جغرافیہ کشمیر

۲۔ گلدستہ کشمیر

۳۔ گوپال نامہ

۴۔ چہار گلزار

۵۔ شگفتہ بہار

۶۔ مخزن خستہ معروف بہ گل بہار

۷۔ سوانح عمری خستہ

ڈاکٹر برج پریمی نے اپنی کتاب ''جموں وکشمیر کی نشو ونما'' میں ہرگوپال خستہ کی ایک اور تصنیف ''گلزار فوائد'' کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ دراصل ایک قصہ ہے جس میں ڈپٹی نذیر احمد کے مراۃ العروس کا تتبع کیا گیا ہے۔ اسلوب سلیس اور واضح ہے کہیں کہیں مقفیٰ اور مسجع

عبارت کا التزام کیا گیا ہے۔

اس اعتبار سے ہر گوپال خستہؔ ریاست جموں و کشمیر کے پہلے ادیب ہیں جنھوں نے اُردو کے نثری سرمایہ میں مستقل اضافہ کیا۔ ''گلدستہ کشمیر'' میں زمانہ قدیم سے لے کر مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے عہد تک کی ریاست کی تاریخ پیش کی گئی ہے۔

ہرگوپال خستہ کے نثری کارناموں میں ان کے انشائیے اور تحقیقی و تنقیدی مضامین بھی شامل ہیں۔ خستہؔ چونکہ ایک طویل عرصہ تک ریاست سے باہر لاہور میں قیام پذیر رہے اس لیے انہوں نے لاہور میں ہی رہ کر کئی اخبارات اور رسالے بھی جاری کئے اور کئی پرچوں کے ساتھ وابستہ بھی رہے مثلاً ''ریفارمر''، ''خیر خواہ کشمیر'' اور ''دیش کی پکار'' وغیرہ۔ آخری عمر میں خستہ کشمیر واپس آکر پہلے مہاراجہ رنبیر سنگھ اور پھر پرتاپ سنگھ کے ساتھ وابستہ ہو گئے۔ افسوس کا مقام ہے کہ خستہ کے نثری کارناموں پر پروفیسر عبدالقادر سروری اور پروفیسر قدوس جاوید کے علاوہ کسی نے توجہ نہیں کی ہے۔

اُردو نثر کے حوالے سے ابتدائی دور میں ہرگوپال خستہؔ کے بعد ان کے چھوٹے بھائی پنڈت سالگ رام سالکؔ کا نام آتا ہے۔ سالکؔ بھی اپنے بھائی خستہؔ کی طرح صاحب قلم تھے اور لاہور میں ہی رہتے تھے۔ سالک ''خیر خواہ کشمیر'' اور ''اودھ اخبار'' لکھنؤ اور اس دور کے دیگر اخبارات و رسائل میں تواتر کے ساتھ مضامین شائع کرواتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد چونکہ انگریزوں کے حوصلے بلند ہو گئے تھے اور وہ پورے ہندوستان میں اپنی تہذیب، زبان اور مذہب کی توسیع کے لیے اقدامات کرنے لگے تھے لہٰذا اس عہد میں عیسائی مشنریوں اور مبلغوں کی آمد کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ عیسائیت کی تبلیغ کے عمل نے ہندوستان کے تعلیم یافتہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں تشویش پیدا کر دی تھی اور عوام کو گمراہ ہونے سے روکنے کے لیے ادیبوں اور دانشوروں نے عیسائیت کے خلاف مضامین اور کتابچوں کی اشاعت شروع کی اور مغربیت کی آندھی کو روکنے کے لیے مشرقیت کی عظمت و انفرادیت سے عوام کو آشنا کرنے کی

کوششیں شروع کیں۔ ہندوستان میں سرسید تحریک، آریہ سماجی تحریک وغیرہ اسی صورت حال کی پیداوار ہیں۔ سالگرام سالکؔ نے بھی عیسائیت کی مخالفت اور ہندو دھرم کی حمایت میں متعدد مضامین لکھے اور کتابیں تصنیف کیں رنبیر سنگھ کے دور حکومت میں سالک بھی اپنے بھائی ہرگوپال خستہ کے ساتھ کشمیر آگئے تھے۔ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے برسراقتدار آنے کے بعد جموں میں سرکاری سرپرستی میں ''سناتن دھرم سبھا'' قائم ہوئی۔ جس کے زیراہتمام عیسائیت کے خلاف کئی کتابچے لکھے گئے۔ سالکؔ نے بھی کئی کتابیں اور کتابچے اُردو میں ہی ترتیب دئے جن کا ذکر گذشتہ صفحات پر کیا جاچکا ہے۔

اس کے علاوہ سالک نے بڑی تعداد میں مضامین بھی لکھے۔ جن کا ذکر تو ملتا ہے لیکن دستیاب نہیں ہیں۔ سالک کا ایک قصہ ''دستان جگت روپ'' کے نام سے ہے جو شائع نہ ہوسکا اور جسے کچھ لوگوں نے ناول بھی مانا ہے۔ سالکؔ کی ایک اور ادبی تصنیف ''گنجینۂ فطرت'' کے نام سے بھی شائع ہوئی۔ ''تحفہ سالک'' نام کا ایک سفرنامہ بھی سالک سے منسوب ہے۔ سالگ رام سالکؔ کی ایک یادگار تصنیف ''رنبیر پینل کوڈ'' قانون تعزیرات جموں وکشمیر آج بھی مقبول ہے۔ اس کے علاوہ مجموعہ ضابطہ دیوانی قانون رجسٹری اور کئی دیگر قانونی دستاویزات کی شرحیں بھی سالک نے لکھی ہیں۔ سالگ رام سالکؔ کے مضامین انقلاب (لاہور) اور اودھ اخبار (لکھنؤ) وغیرہ میں بھی شائع ہوتے رہتے تھے۔

اُنیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں ریاست جموں وکشمیر کے کئی شاعروں اور نثر نگاروں کی تخلیقات لاہور، امرت سر، الہ آباد اور لکھنؤ کے اخبارات میں شائع ہوتی تھیں۔ جموں وکشمیر کے حالات کے بارے میں خبریں بھی لاہور کے اخبارات میں لگاتار شائع ہوتی تھیں۔ اس ضمن میں خاص طور پر مولانا غلام رسول مہر اور عبدالمجید سالک کا اخبار ''انقلاب'' سب سے آگے تھا۔ روزنامہ ''انقلاب'' ۱۹۲۷ء میں مولانا مہر اور سالک نے لاہور سے جاری کیا تھا اور جب ۱۹۳۱ء میں شیخ محمد عبداللہ کی قیادت میں کشمیر (متحدہ) کی

آزادی کی تحریک شروع ہوئی تو ''انقلاب'' کے صفحات کشمیر کے حالات وکوائف کے لئے وقف رہنے لگے۔ انگریزی حکومت نے انقلاب کے مدیران کوان کی کشمیر نوازی کے لیے طرح طرح سے تنگ کرنا شروع کیا۔ پانچ ہزار کی ضمانت طلب کی اور پھر کشمیر میں اخبار ''انقلاب'' کا داخلہ بند کر دیا گیا۔ اس پر ادارہ انقلاب نے ''مظلوم کشمیری''، ''مکتوب کشمیر'' اور ''مظلوم'' کے نام سے اخبار نکالے لیکن ڈوگرہ حکومت ان پر پابندیاں عائد کرتی چلی گئی۔ ان اخبارات میں کشمیر، جموں اور لاہور کے کشمیری ادیبوں اور دانشوروں کے مضامین لگاتار شائع ہوتے رہتے تھے۔ لاہور میں مقیم مشہور کشمیری ادیب اور دانشور محمد الدین فوق نے اُردو نثر میں کئی یادگار تصنیفات چھوڑی ہیں۔ مثلاً تاریخ اقوام کشمیر ''اکبر''، ''انارکلی''، ''خواتین کشمیر'' وغیرہ۔ محمد الدین فوق نے مہاراجہ رنبیر سنگھ کے زمانے میں ریاست سے اخبار جاری کرنے کی اجازت کئی بار مانگی لیکن انہیں اجازت نہیں ملی۔ فوق نے لاہور سے ایک اخبار ''کشمیری'' کے نام سے جاری کیا جس میں وہ خود بھی لکھتے تھے اور دوسروں سے بھی لکھواتے تھے۔ اخبار ''کشمیری'' میں اکثر علامہ اقبال کا کلام بھی شائع ہوتا تھا۔ کشمیر کے عظیم شاعر مہجورؔ نے اپنی اُردو نثری تصنیف ''حیات رحیم'' (مطبوعہ ۱۹۲۲ء) میں فوق کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''۔۔۔فوق کا نام کشمیر جدید کی تاریخ میں مورخ آبِ زر سے لکھیں گے جس نے صدہا میل اپنے وطن ''قدیم کشمیر'' سے دور رہ کر اپنے پس ماندہ اہل خطہ بھائیوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے اور اس خطہ مہر یر کے منجمد اور ساکن خون کو حرکت وحرارت میں لانے کے لیے اخبار ''کشمیری''، جاری کیا''۔ [۱۳]

محمد یوسف ٹینگ نے ''حیات رحیم'' کو اہل کشمیر کی پہلی نثری اُردو تخلیق قرار دیا ہے۔ بقول محمد یوسف ٹینگ۔

''ہرگوپال خستہ کی تصنیف ''گلدستہ کشمیر'' کو اس لحاظ سے پہلی اُردو

کتاب تسلیم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ خستہ نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ پٹیالہ میں بسر کیا تھا۔ پھر وہ کشمیری زبان بے ساختگی سے بولنے کا بھی متحمل نہیں تھا۔ اسی طرح فوقؔ اگرچہ کشمیری تھے لیکن ان کی پیدائش پنجاب میں ہوئی تھی۔ وہ بھی بعض روایات کے مطابق کشمیری زبان بولنے کی اہلیت سے محروم تھے۔ لہٰذا مہجور کو یہ سعادت نصیب ہوئی وہ وطن عزیز کا پہلا فرزند تھا جس نے ایک مکمل اور مدلل اُردو کتاب تحریر کی"۔ ۱۴

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ علامہ اقبال بھی کشمیری نژاد تھے۔ ان کی پیدائش بھی کشمیر میں نہیں پنجاب کے شہر سیالکوٹ میں ہوئی تھی۔ اور یہ بھی طے ہے کہ علامہ اقبال کو کشمیری نہیں آتی تھی۔ اس کے باوجود ہر کشمیری اقبال کو نہ صرف کشمیری مانتا ہے بلکہ اس پر فخر بھی کرتا ہے۔ بلکہ جموں وکشمیر کا تعلیم یافتہ طبقہ منٹو، ساحر لدھیانوی اور میراجی کے کشمیر النسل ہونے پر ناز کرتا ہے۔ گلوبلائزیشن اور کمپیوٹر لینگویج کے اس دور میں کسی کشمیری نژاد شخص کو محض اس وجہ سے کشمیری ماننے سے انکار کرنا کہ وہ کشمیر میں پیدا نہیں ہوا اور وہ کشمیری بولنے کی اہلیت نہیں رکھتا ہے، ایک غیر منصفانہ فعل ہوگا دنیا کے مختلف ممالک میں لاکھوں ایسے کشمیر النسل لوگ ہیں جو نہ تو کشمیر میں پیدا ہوئے اور نہ ہی وہ کشمیری زبان بے ساختگی سے بولنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ پھر بھی سوال یہ ہے کہ کیا ان کو کشمیری ماننے سے انکار کرنا مناسب ہوگا۔

بہر حال ریاست جموں وکشمیر میں غیر افسانوی اُردو نثر کے حوالے سے بیسویں صدی کے اوائل میں ایک اہم نام کشمیر غلام احمد مہجورؔ کا آتا ہے۔ مہجورؔ نے ۱۲۸ صفحات پر مشتمل، صفاپور کے ایک بزرگ ولی رحیم صاحب قلندر کی سوانح عمری "حیات رحیم" کے نام سے لکھی جو ۱۹۲۲ء میں شائع ہوئی "تذکرہ شعرائے کشمیر" مہجورؔ کا ایک اور نثری کارنامہ ہے۔ لیکن یہ کتاب شائع نہ ہوسکی مہجور کے پوتے ابدال مہجور دعویٰ کرتے ہیں کہ اس کتاب کا قلمی نسخہ ان کے پاس محفوظ ہے۔ اس مسودے میں چار سو دس (۴۱۰) صفحات ہیں اس میں کشمیری شاعری کو تین

ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔

۱۔ ایک ہزار ہجری تک کے شعرا کا دور

۲۔ ۱۰۰۰ء سے ۱۲۲۹ء تک کے شعرا کا کارنامہ

۳ ۱۲۳۰ء سے ۱۳۱۳ء تک کے شعرا کا دور۔

مہجور کا ایک اور مختصر اُردو مسودہ ''آئینہ اتحاد'' بھی ہے جس میں ۱۹۳۱ء میں ریاست کے بعض علاقوں میں پھوٹ پڑنے والی فرقہ واریت کی مذمت کی گئی ہے اور فرقہ وارانہ اتحاد پر زور دیا گیا ہے۔ مہجور نے ''کلام شیخ نورالدین ریشی کا مسودہ بھی تیار کیا اور مسودے کے آغاز میں لکھا ہے:

> ''خدا کا شکر ہے کہ راقم الحراف کو خدا نے شیخ نورالدین ریشی کے کلام کو جمع کرنے کی توفیق بخشی اور آج مورخہ اول ماگھ ۲۰۱۸ء مسودہ مکمل کرتا ہوں''۔

مہجور نے ''سفرنامہ لداخ'' کے عنوان سے بھی ایک مسودہ تیار کیا تھا۔ محمد یوسف ٹینگ نے اپنی کتاب ''مہجور شناسی'' میں لکھا ہے کہ یہ سفرنامہ لداخ اور کرگل کے ۱۹۰۹ء کے بندوبست سے متعلق ہے اور یہ مسودہ سفرنامہ بلتستان کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ ابدال مہجور شاعر کشمیر کے ایک اور غیر مطبوعہ مسودے کا ذکر کرتے ہیں۔ جس کا عنوان ''انقلاب کشمیر'' ہے۔ یہ مسودہ جان محمد آزاد کے مطابق چالیس صفحات پر مشتمل ہے۔ ابدال مہجور کے مطابق اس مسودے کے پہلے صفحے پر یہ عبارت تحریر کی گئی ہے۔

> ''انقلاب کشمیر جس میں ساکنان خطہ کشمیر گوشہ جنت نظیر کی گذشتہ شوکت و برتری اور موجودہ ذلت وپستی اور آئندہ عظمت و بہتری پر تاریخی بحث کی گئی ہے اور کشمیر کی قومی اولوالعزمی کے ساتھ بے نظیر ہندو مسلم اتحاد پر روشنی ڈالی گئی ہے''۔ [۱۵]

اس کے علاوہ مہجور نے ''سوانح حبہ خاتون'' کے عنوان سے بھی ایک کتاب تیار کی تھی۔

اس کے علاوہ بیسویں صدی کے اوائل میں ریاستی حکمرانوں کے ظلم و جبر اور عوام کے عبرتناک مسائل سے متعلق مہجور نے ایک روئداد بھی لکھی تھی۔ ۱۹۳۱ء میں کشمیر میں تحریک آزادی کی شروعات میں اس روئداد کا بھی بڑا ہاتھ دیا ہے۔ اس روئداد کی نثر صاف شستہ اور عام فہم ہے۔ مہجور نے کشمیری زبان و ادب سے متعلق ایک مضمون ہفت روزہ ''البراق'' میں ابورشید کاشمیری کے نام سے شائع کروایا تھا۔ جان محمد آزاد کے مطابق مہجور نے ''پٹواری'' کے نام سے ایک کتابچہ بھی لکھا تھا۔ اور ایک ناول ''عزیز'' (نام سے) بھی مہجور سے منسوب ہے۔ غرض یہ کہ کشمیر میں شاعر کشمیر مہجور کے اُردو نثر کے فروغ و ارتقا میں اہم کردار کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

ریاست جموں و کشمیر میں غیر اُردو نثر کے حوالے سے شورش کاشمیری کا ذکر بھی ناگزیر ہے شورش بنیادی طور پر شاعر تھے لیکن تحریک کشمیری کے آغاز کے دنوں میں لاہور سے اخبار چٹان نکالتے تھے۔ کشمیر سے متعلق ان کی نظموں اداریوں اور مضامین کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ شیخ محمد عبداللہ نے آتش چنار میں شورش کاشمیری کو بڑی محبت اور عقیدت سے یاد کیا ہے۔

کشمیر میں اُردو کو فروغ دینے میں یہاں کی کئی ادبی انجمنوں اور ریاستی یونیورسٹیوں (جموں یونیورسٹی، کشمیر یونیورسٹی) کا بھی ہاتھ رہا ہے۔ اس کے لئے اس حقیقت کا علم ہونا ضروری ہے کہ سرکاری سرپرستی کے ساتھ ساتھ اُردو کو عوامی سطح پر بھی مقبولیت حاصل رہی ہے۔ یہ وہ واحد زبان تھی جو میں عام پڑھے لکھے لوگ نہ صرف اپنے خیالات پیش کرتے تھے بلکہ زبان اور اسی زبان کا ادب بھی ان کے مطالعہ میں رہتا تھا۔

۱۹۴۷ء سے پہلے کے زمانے میں وادی کے ساتھ ساتھ جموں میں جن شاعروں اور ادیبوں کے نام برصغیر کے اُردو دان طبقوں میں جانے پہچانے تھے وہ بھی اُردو ہی لکھا کرتے تھے۔ ان میں رامانند ساگر، پروفیسر نندلال کول طالب، پریم ناتھ پردیسی، پریم ناتھ در، کنول

نین پرواز، شہہ زور کاشمیری، شوریدہ کاشمیری، محمد الدین فوق، محمد عمر نور الہٰی، غ۔م۔ طاوس، غلام رسول نازکی، عبدالحق برق، قیصر قلندر اور کئی شعراء واد باء نے آزادی سے پہلے ریاست جموں وکشمیر میں ہی اُردو کو فروغ نہیں دیا بلکہ کم از کم مذکورہ فنکار پنجاب اور دلی کے اُردو داں طبقوں میں بھی مقبول ہو چکے تھے۔

جب تک تقسیم ملک کے بعد اُبھرنے والے اُردو شعراء واد باء کا ذکر نہ کیا جائے تو جموں وکشمیر میں اُردو زبان وادب کے فروغ وارتقاء کا کوئی بھی جائزہ مکمل نہ ہوگا۔ اس دور میں شمیم احمد شمیم، حامدی کاشمیری، محمد یوسف ٹینگ، اکبری حیدری، اکبر لداخی، پشکر ناتھ، تیج بہادر بھان، مخمور بدخشی، غلام نبی خیال، سلطان الحق شہیدی، حکیم منظور، ہمدم کاشمیری، پرتپال سنگھ بیتاب، آنند لہر، خالد حسین، نور شاہ، رفیق راز، بلراج بخشی، اکبر جے پوری، ویندر پٹواری، محمد زمان آزردہ اور دوسرے فن کاروں نے اُردو کی آبرو بنائے رکھی۔ اور اپنی لگن، محنت اور خلوص سے چند ہی برسوں میں ریاست کی اُردو ادب کی تاریخ میں اپنے نئے انداز بیان، نئے افکار، نئے موضوعات اور نئے ولولوں کے ساتھ جموں وکشمیر کے اُردو ادب کو ملک کے دوسرے حصوں کے ہم عصر اُردو ادب کے قریب لا کھڑا کیا۔ یہ فضا ۱۹۶۰ء تک اپنے شباب پر رہی بعد میں ملک گیر پیمانے پر ادب میں تحریکوں کے اُبھرنے کے ساتھ ساتھ وادی میں بھی جدیدیت کے رجحان اور دیگر لسانی، موضوعاتی اور تکنیکی تجربات کا وادی کے لکھنے والوں پر بھی براہ راست اثر ہوا۔ یوں کہنہ مشق لکھنے والوں کے ساتھ ساتھ کچھ نئے نام سامنے آنے لگے۔ ان میں فاروق نازکی، فرحت گیلانی، صادق علی اسیر، ہردے کول بھارتی، نور شاہ، بنسی نردوش وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

موجودہ دور کے شعراء واد باء اور محققین وناقدین میں ریاست جموں وکشمیر میں اُردو زبان وادب کی آبیاری کرنے والوں کے یہاں سینکڑوں نام ہیں، جن کو اس باب میں تفصیلاً بیان کرنا مشکل ہے۔ البتہ مذکورہ قلم کاروں کے تذکرے کے بغیر یہ کام کسی بھی طرح مکمل تصور

نہیں کیا جائے گا۔ ان میں کئی کہنہ مشق نام آور اور نو جوان مصنفین کی ایک دلفریب کہکشاں (فہرست) ہے۔ جو بیسوی صدی کی آخری دہائیوں سے لے کر آج اکیسوی صدی کی پہلی اور دوسری دہائی میں بھی اُردو زبان اور ادب کی آبیاری اپنے خونِ جگر سے کر رہے ہیں۔ موجودہ دور میں ریاستی زبان و ادب کو فروغ دینے والوں میں سیفی سوپوری، مظفر ایرج، ہمدم کاشمیری، مخمور بدخشی، طاہر مضطر، غلام نبی خیال، عرش صہبائی، عابد مناوری، حامدی کاشمیری، قاضی غلام، ریاض پنجابی، بشیر کلدیپ، شجاع سلطان، شبنم قیوم، ترنم ریاض، قدوس جاوید، ظہور الدین، محمد علی حسینی، غلام رسول ملک، شہباز راجوری، صابر مرزا، شبنم قیوم، ثنااللہ بٹ، صوفی غلام محمد، رفیق راز، ترنم ریاض، رخسانہ جبیں، نسرین نقاش، شفیقہ پروین، عارفہ بشریٰ، نور رشاہ، محمد یوسف ٹینگ، جاوید آزر، پریمی رومانی، فرید پربتی، خالد بشیر، شمس الدین شمیم، شفق سوپوری، زاہد مختار، احمد شناس، قاسم سجاد، مبشر رفاعی، یوسف عاجز، جی۔ ایم آجر، حسن ساہو، شبیب رضوی، بلرج بخشی، وجید احمد اندرابی، طاہر محی الدین، ظہور الدین، بشیر احمد نحوی، الطاف انجم، محمد زمان آزردہ، سلیم سالک، مجید مضمر (مرحوم) نذیر ملک، شہاب عنایت ملک، نصرت آراء چوہدری، ضیاء الدین، محمد ریاض احمد، اسداللہ وانی، ریاض توحیدی، مشتاق حیدر، راہگیر لداخی وغیرہ کے نام سرفہرست ہیں۔

مجموعی طور پر ریاست جموں وکشمیر میں اُردو نثر کے حوالے سے صحافت، تحقیق وتنقید، سفرنامہ اور انشائیہ نگاری کا باقاعدہ ارتقاء ۱۹۴۷ء کے بعد ہوتا ہے۔ جس کی تفصیل آئندہ ابواب میں دی جائے گی۔ یہاں صرف اتنا کہنا کافی ہوگا کہ جموں وکشمیر میں اُردو زبان کی تشکیل کا عمل اس ریاست میں مسلم دور حکومت کے قیام اور فارسی داں اولیا کرام کی آمد کے بعد شروع ہو گیا تھا اور ڈوگرہ حکومت کے قیام تک آکر اُردو میں شعری اور نثری تخلیقات کی پیش کش کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا۔ ۱۸۸۸ء میں اُردو کو ریاست کی سرکاری زبان کا درجہ دئے جانے کے بعد سے

۱۹۴۷ء تک کشمیر کے شاعروں اور ادیبوں نے اُردو شعر و ادب کے سرمائے میں ہر پہلو سے اضافہ کیا اور آج اس ریاست میں اُردو زبان و ادب کی صورت حال بعض خامیوں کے باوجود اتنی ہمہ جہت اور اطمینان بخش ہے کہ جموں وکشمیر کو بھی دہلی، لکھنؤ، لاہور، کراچی، عظیم آباد وغیرہ کی طرح اُردو کا ایک اہم مرکز مانا جاتا ہے۔

حواشی

۱ عبدالاحد آزاد۔ کشمیری زبان اور شاعری حصہ اول۔ ص ۴۰۔ ناشر۔ جموں وکشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگو یجز۔ ۱۹۸۲ء

۲ عبدالقادر سروری کشمیر میں اُردو، ص ۱۹۔ ناشر جموں وکشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگو یجز نیا اڈیشن، ۱۹۹۳ء

۳ ایضاً ۱۳۸

۴ شیخ محمد عبداللہ، آتش چنار، ص ۲۵۶۔ ناشر گلشن بکس، ریزیڈنسی روڈ سرینگر، ۲۰۰۸ء (دوسرا ایڈیشن)

۵ حفیظ جالندھری بحوالہ ،، ص ۲۶۵، ،، ،، ،،

۶ ڈاکٹر برج پریمی۔ جموں وکشمیر میں اُردو ادب کی نشو ونما، ص ۱۸۔ ناشر رچنا پبلی کیشنز، نعیب نگر، پیوش کالونی جانی پورہ جموں، ۱۹۹۲ء

۷ ڈاکٹر برج پریمی اہمہ۔ جموں وکشمیر میں اُردو ادب کی نشو ونما، ص ۲۰۔ ناشر۔ رچنا پبلی کیشنز جموں ۲۰۰۴ء (تیسرا ایڈیشن)

۸ عبدالقادر سروری۔ مضمون ''مہاراجہ رنبیر سنگھ اور ان کا دارالترجمہ'' مشمولہ ''ترجمہ کا فن اور روایت''۔ از۔ ڈاکٹر قمر رئیس، ص ۲۹۴۔ ناشر۔ ایجوکیشنل بک ہاوس علی گڑھ ۲۰۱۱ء (دوسرا ایڈیشن)

۹ اختر الدولہ۔ اختر شہنشاہی۔ مطبوعہ، اختر پریس لکھنؤ، ۱۸۸۸ء بحوالہ کشمیری پر اُردو کے اثرات از، ڈاکٹر نذیر آزاد۔ ناشر۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی، ۲۰۱۲ء

۱۰ دیباچہ گلدستہ کشمیر۔ از ہرگوپال خستہ، ص ۱۱ ناشر۔ شاہین پبلشرز، مائسمہ سرینگر کشمیر ۱۹۸۶ء

۱۱ مہجور۔ حیات رحیم، ص ۹ ۱۹۲۲ء

۱۲ محمد یوسف ٹینگ، مہجور شناسی۔ ص ۲۹۔ ناشر۔ کلچرل اکادمی سرینگر، ۱۹۸۷ء۔

جموں وکشمیر میں اردو افسانوی ادب

۲۰۰۰ء تا ۲۰۱۳ء

یہ سچ ہے کہ دنیا کی متعدد زبانوں میں نثر کا جنم شاعری کے بعد ہوا ہے اور شاعری کے مقابل شہرت حاصل کی۔ نثر کیا ہے یہ ایک طویل بحث ہے لیکن میں مختصراً یہ بتاتا چلوں کہ نثر وزن، قافیہ اور ردیف کی پابندی سے آزاد ایک ایسی تحریر جو لفظوں، فقروں اور جملوں کی منطقی اور نحوی ساخت پر اصرار کرے نثر ہے۔ نثر کی متعدد اصناف ہیں جن میں داستان، ناول، افسانہ، تاریخ، سوانح، طنز ومزاح، رپورتاژ، سفرنامہ اور دیگر مضامین شامل ہیں۔ یہاں ان اصناف کا تاریخی جائزہ پیش نہیں کیا جائے گا چونکہ موضوع اکیسویں صدی ہے تو مناسب سمجھتا ہوں براہ راست افسانوی ادب کا جائزہ پیش کروں۔

اُردو ناول:۔ جموں وکشمیر اپنے دلفریب حسن اور فطری دلکشی کے باعث اردو ادب کا ایک مستقل موضوع ہے۔ یہاں صدیوں کے ظلم و جبر اور خطئہ رنگ ونور کے باسیوں کی ناقابل بیان حالت نے حساس ادیبوں اور شاعروں کو سوچنے پر مجبور کیا ہے۔ ایک کامیاب ناول نگار کی یہ خاصیت بھی ہوتی ہے کہ وہ زندگی اور سماج سے قریب تر ہو۔ سرزمین کشمیر ان موضوعات کو اپنے

دامن میں بحسن وخوبی سمیٹے ہوئے ہے جو ہر احساس ادیب کے ذہن وقلم کا سبب بنتے آئے ہیں ۔اردو ناول چونکہ ایک وسیع کینوس کا حامل ہے تو زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ بھی کرتا ہے ۔ادب سے دلچسپی رکھنے والے مقامی ادیبوں نے بھی اس صنف کو ذریعہ اظہار بنایا اور کامیاب ناول دیئے ۔یہاں سوال یہ ذہن میں آتا ہے کہ ریاست جموں وکشمیر کا پہلا ناول نگار کون ہے تو یہ ایک طویل بحث ہے اس لئے کسی بھی دعوے کو میں حرف آخر سمجھ کر نہیں اپنی رائے نہیں دے سکتا ۔اس سوال کے جواب کے لئے میری تحقیقی کوشش جاری ہے جب کسی مستند ثبوت کا سراغ ملا تو اپنی رائے کا رکھنا مناسب سمجھوں گا۔

جموں وکشمیر میں اُردو ناول کی اگر اکیسویں صدی میں بات کی جائے تو صرف چند ناول نگاروں کے نام سامنے آتے ہیں اور اُن کے ناولوں کی تعداد اتنی کم ہے کہ یہ ناول انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں ۔اس کی وجہ یہ ہے کہ جموں وکشمیر میں اُردو ناول کی روایت ویسے بھی کوئی زیادہ پرانی نہیں ہے ۔یہاں آزادی کے بعد ہی اُردو ناول کی طرف توجہ دی گئی ہے اور جس طرح یہاں اُردو افسانے کو فروغ ملا ہے اُس اعتبار سے اُردو ناول کی صورتِ حال مایوس کن ہے۔ یہاں ناول کم لکھے گئے ہیں لیکن جو ناول وجود میں آئے ہیں وہ بھی بلاشبہ ان فنی معیاروں کی کسوٹی پر پورے نہیں اُترتے ہیں جو اُردو میں کرشن چندر، عصمت چغتائی ،قرۃ العین حیدر، انتظار حسین یا پھر موجودہ دور میں مشرف عالم ذوقی، پیغام آفاقی ،غضنفر اور عبدالصمد وغیرہ نے قائم کئے ہیں ۔لیکن پھر بھی بعض ناول ایسے ہیں جن کی شہرت ومقبولیت ریاستی سطح پر ہی نہیں ہے بلکہ ملکی سطح پر بھی مسلم ہے بقول نور شاہ۔

> ''ناول نگاری کے پس منظر میں یہ کہنے میں کوئی جھجک نہیں کہ ریاست سے تعلق رکھنے والے اُردو ادیبوں اور قلم کاروں کو ناول کی بجائے افسانوں میں دلچسپی رہی ہے اور افسانوی ادب کو ایک مقام دلانے میں وہ بہت حد تک کامیاب بھی ہو چکے ہیں ۔اس بات میں کوئی شک نہیں

کہ ریاست میں جتنے بھی ناول لکھے گئے وہ ریاست سے باہر ناول نگاروں کے ناولوں سے کسی طور پر کمزور نہیں بلکہ ان میں سے اکثر ناول ملکی سطح کے معیار پر پورے پورے اُترتے ہیں۔''

جموں وکشمیر میں لکھے جانے والے اُردو ناول فنی، تکنیکی اور موضوعی اعتبار سے کافی حد تک روایتی ہیں۔ ان ناولوں کی مقبولیت وشہرت کا سبب جنتِ بے نظیر ہے یعنی ان ناولوں میں کشمیر کے متعدد موضوعات، سیاسی، سماجی، معاشرتی، تہذیبی، سحر آلود مناظر، فطری حسن اور یہاں کی سسکتی، تڑپتی زندگی کے رنگوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ بلکہ یہ ناول کشمیر کی سچی اور حقیقی زندگی کو پیش کرتے ہیں۔

ریاست جموں وکشمیر میں اُردو ناول نگاری نے باقاعدہ طور پر ۱۹۴۷ء کے بعد آنکھ کھولی ہے۔ اس سے پہلے جو ناول لکھے گئے وہ اخباروں میں قسط وار شائع ہوتے رہے لیکن پریم ناتھ پردیسی کا ناول ''پوتی'' شائع ہوتے ہوتے رہ گیا کیونکہ تقسیم ملک کے وقت اس کا مسودہ ضائع ہوگیا۔ ''اور انسان مرگیا'' رامانند ساگر کا فسادات پر ایک اہم ناول مانا جاتا ہے۔ اس ناول کو رامانند ساگر نے ابتدا میں ''فساد اور امن'' کے نام سے لکھنا شروع کیا تھا۔ خواجہ احمد عباس ناول کے پیش لفظ میں اپنے تاثرات یوں بیان کرتے ہیں۔

''یہ ہنگامی لٹریچر نہیں ایک کلاسیک ہے۔ اس کے قلم سے نکلے ہوئے الفاظ مرتی ہوئی انسانیت کی صدائے بازگشت ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ اس میں آپ خوب پہچان لیں گے کہ انسانیت کی مرنے کے بعد شکل کیا ہو جاتی ہے۔''[1]

ڈاکٹر برج پریمی ناول ''اور انسان مرگیا'' کے بارے میں اپنی کتاب ''جموں وکشمیر میں اردو ادب کی نشو ونما'' میں اس طرح رقمطراز ہیں۔

''فسادات کے موضوع پر لکھا ہوا یہ ناول کافی متنازعہ فیہ رہا اور ایک

عرصے تک پورے برصغیر کے ادبی حلقوں میں موضوع بحث بنا رہا
------- -----یہ ناول انتہائی ذہنی اور جذباتی خلفشاروں
کے دوران ایک ہنگامی موضوع پر لکھا گیا ہے۔جس کی بنیاد فرقہ وارانہ
فسادات ہیں''۔ ۲

ریاست جموں وکشمیر میں مذکورہ ابتدائی دور کے لکھے گئے ناولوں کا ذکر تو ریاستی ادب کی تاریخی کتابوں میں ہر جگہ ملتا ہے لیکن مایوس کن بات یہ ہے کہ یہ ناول آج کہیں بھی دستیاب نہیں ہیں۔

نرسنگھ داس نرگس نے جموں کے دیہاتوں کے پس منظر میں ناول لکھے ہیں۔نرگس ایک ادیب، ناول نگار اور افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بلند پایہ صحافی بھی تھے۔ان کے ناولوں میں ''پاربتی''، ''نرملا'' خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

نرسنگھ داس نرگس کے ہم عصروں میں کشمیری لال ذاکر اور ٹھاکر پونچھی کے نام بھی کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔کشمیری لال ذاکر نے ''سیندور کی راکھ'' لکھ کر ناول نگاری کے میدان میں اپنی پہچان بنائی اور بعدہ انہوں نے کئی کامیاب ناول تخلیق کر کے ادبی دُنیا میں اپنا ایک الگ مقام بنالیا۔ان کے اہم ناولوں میں ''انگوٹھے کا نشان''، ''دھرتی صدا سہاگن رہے''، ''کرماں والی''، ''لمحوں میں بکھری زندگی''، ''جاتی ہوئی رت''، ''خون پھر خون ہے''، ''ڈوبتے سورج کی کتھا''، ''چھٹی کا دودھ''، ''چار میل لمبی سڑک'' اور ''میں اسے پہچانتی ہوں'' وغیرہ قابل قدر ناول ہیں۔

ٹھاکر پونچھی بحیثیتِ افسانہ نگار کسی زمانے میں بہت معروف تھے لیکن ان کی شہرت و مقبولیت کی وجہ ان کے ناول ہی ہوئے۔جن میں ''رات کے گھونگھٹ''، ''وادیاں اور ویرانے''، ''شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک''، ''چاندنی کے سائے''، ''پیاسے بادل''، ''یادوں کے کھنڈر''، ''زلف کے سر ہونے تک'' اور اب میں وہاں نہیں رہتا'' اہم اور کامیاب ناول اردو

ادب کو دیئے ہیں۔ ان کے ناولوں کی فنی خصوصیات کو تفصیلاً بیان کرنے کے بجائے مناسب یوں ہے کہ برج پریمی کا یہ قول نقل کیا جائے۔

''ٹھاکر پونچھی کے ناولوں میں ایک طرف ترقی پسندی کے رجحانات کار فرما ہیں اور دوسری طرف ڈوگرہ طرز زندگی کی حقیقت آمیز تصویریں بھی ملتی ہیں''۔ [۳]

ٹھاکر پونچھی کے بعد تیج بہادر نے ولر جھیل کے پس منظر میں ایک خوبصورت ناول ''سیلاب اور قطرے'' لکھا ہے۔ جس میں ایک غریب سنگھاڑے جمع کرنے والے خاندان کی زندگی کی روداد ہے۔ غلام رسول سنتوش نے بھی چند کہانیوں کے علاوہ ایک ناول ''سمندر پیاسا ہے'' لکھا جو ایک بیانیہ ناول ہے۔ علی محمد لون بحیثیت افسانہ نگار پوری دنیا میں معروف ہیں۔ لیکن ایک زمانے میں انہوں نے بھی اپنے قلم کا ذوق بدلنے کے لئے اپنا رجحان ناول کی طرف مرکوز کیا۔ انہوں نے ''شاید ہے آرزو تیری'' ایک ہی ناول لکھا۔ جس میں دہلی کی معاشرت کو دوربینی کے ساتھ پیش کرنے کی سعی کی ہے۔

ریاست جموں وکشمیر میں اکیسوی صدی کے ناول نگاروں میں اُنہیں لوگوں کو شمار کیا جاتا ہے جو گذشتہ ایک دو دہائیوں سے اُردو ناول نگاری کو فروغ بخشتے آرہے ہیں۔ اور وہ لوگ آج بھی اپنے خونِ جگر سے اس صنف کی آبیاری میں محو ہیں۔ ان میں نور شاہ، حامدی کاشمیری، ترنم ریاض، آنند لہر، جان محمد آزاد، حشی سید ساحل، خواجہ فاروق اور بھوشن لال بھوشن وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

نور شاہ نے دو ناول ''نیلی جھیل کالے سائے'' اور ''پائل کی زنجیر'' لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے تین ناولٹوں کا مجموعہ ۲۰۰۹ء میں میزان پبلشرز سرینگر نے ''نور شاہ کے تین ناولٹ'' کے نام سے شائع کیا ہے۔ اگر ان ناولٹوں کو بھی ناول مان لیں تو پھر نور شاہ کے نالوں کی تعداد پانچ ہو جاتی ہے۔ افسانوں کی طرح نور شاہ کے ناول بھی ان کے مخصوص مزاج اور

ذوق جمال کے ہی آئینہ دار ہیں۔ نور شاہ کا ناول ''آؤ سو جائیں'' ماہنامہ شاعر کے ناولٹ نمبر میں شائع ہوا۔ ''شاعر'' کے مدیر اعجاز صدیقی نے نور شاہ کے فنی خصوصیات کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''نور شاہ کی تحریروں میں زخم خوردہ دلوں کی دھڑکنیں ملتی ہیں، اندازِ بیان میں شگفتگی رچاؤ اور موسیقی ہے۔ کچھ تو حیات پرور پہاڑی وادیوں کی عظمت وجلال کی دین ہیں اور کچھ اپنے ماحول اور طبقے کی رہین منت، نور شاہ بطورِ کہانی کار مقبول ومعروف ہیں۔ نور شاہ کی تحریروں میں شعور کی فکر اکثر ملتی ہیں۔ زبان واسلوب فنکارانہ اور شاعرانہ ہے'' آؤ جائیں'' جہاں ایک لمحے کی کہانی ہے۔ وہیں ایک یگ کیکہانی بھی ہے۔ اس ناول میں نور شاہ نے ایک خاص ماحول اور اس ماحول میں رہنے والے کرداروں کی نقاب کشائی اپنے منفرد ڈھنگ سے کی ہے۔'' ؎

اعجاز صدیقی کی مذکورہ بالا رائے سے نور شاہ کے ناولوں کی زبان اور اسلوب کا بلخصوص ہو جاتا ہے۔ عام لوگوں کے علاوہ خود نور شاہ بھی یہ مانتے ہیں کہ ''زندگی کے دھارے رومان کے چشموں سے ہی پھوٹتے ہیں''۔ لیکن یہ رومان عام معنی کا رومان نہیں ہے بلکہ رومان کا یہ تصور اس پوری کائنات کے بارے میں مثبت سوچ سے عبارت ہے۔ نور شاہ لازوال حسن فطرت کے حوالے سے انسانوں کے ذہن وضمیر میں پوشیدہ حسن وخیر کی قدروں کو نمایاں کرنے پر یقین رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں کشمیر کے حسن کو برف پوشپہاڑوں، سرسبز وادیوں باغوں اور دریاؤں کے حوالے سے تو سمیٹا ہی ہے لیکن کشمیر کی ثقافت اور اہل کشمیر کی سادہ لوحی اور حلیمی کو اپنے کرداروں کے ذریعے جیتے جاگتے روپ میں پیش کیا ہے۔ سلونی، صنوبر، راشد، برج، نیلی، اقبال، اختر، سلمی، احسن وغیرہ نور شاہ کے ناولوں کے اہم کردار ہیں۔ نور شاہ نے یہ کردار محنت سے تراشے ہیں۔ نور شاہ کے کردار سادہ بھی ہیں،

احسن کی طرح پیچیدہ بھی ہیں۔ اختر کی طرح نور شاہ نے اپنے کرداروں کی نفسیات کا تجزیہ جگہ جگہ بڑی مہارت اور سچائی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ لیکن نور شاہ کے بعض کرداروں کی سچائیاں عام قارئین کو ناگوار بھی لگ سکتی ہیں۔ مثلاً ان کے ناول ''آؤ سو جائیں'' کے کردار ''راشد'' ناول کی ہیروئن ''نیلی'' سے یہ کہتا ہے۔

> ''میں حقیقی زندگی کا قائل ہوں۔ اسی لیے ذہنی رشتوں پر جسمانی رشتوں کو ترجیح دیتا ہوں''۔ ۵

نور شاہ اپنے ناولوں میں جدید موضوعات اور کرداروں کو پیش کرتے ہوئے بھی اپنی زمین اور اپنے کشمیر کو نہیں بھولتے ہیں۔

> ''یہ کوئی بہادری نہیں کہ تم نے اپنے مکان کی سیڑھیوں پر سونا بچھا رکھا ہے اور گھر میں صندل کے دروازے اور کھڑکیاں لگا رکھی ہیں یا اس کی اونچی بنیادیں سونے کی انیٹوں سے تعمیر کی ہیں۔ بہادری تو یہ ہے کہ تم اپنی سچائی کی تلوار سے کھلینا سیکھو۔ یہ آزادی کی باتیں شاعر، کشمیر آزاد کی آواز ہے، عوام ظلم، غربت، ناانصافی، پس ماندگی اور جہالت کا شکار بنے ہوئے ہیں۔ اور خود غرض لیڈر شان وشوکت سے رہتے ہیں۔ یہ کشمیر ہے۔ بڈ شاہ کا کشمیر، لل دید اور نور شاہ الدین ولی کا کشمیر یہ میرا کشمیر ہے.......... میرا گھر رات اتنی تاریک کیوں ہے؟ یہ اندھیرا کیسا ہے؟'' ٦

نور شاہ نے افسانوں کی طرح اپنے ناولوں میں بھی بیانیہ کے مختلف تجربے کیے ہیں۔ کرداروں کی خارجی اور باطنی دنیاؤں کو کبھی بلاواسطہ تو کبھی بالواسطہ پر بڑی باریک بینی سے پیش کیا ہے۔ اکثر نور شاہ کا اسلوب ایک دلکش استعاراتی فضا کی تشکیل بھی کرتا ہے جو ان کے مخصوص رومانی مزاج سے ہم آہنگ ہے۔

ریاست جموں کشمیر میں ہی نہیں بلکہ کلی طور پر اُردو فکشن کی روایت کو مستحکم کرنے میں ترنم ریاض کا نام سرفہرست ہے۔ ترنم ریاض ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں اور خود بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون ہیں۔ اُردو فکشن میں وہ افسانہ اور ناول کے علاوہ صحافت، تنقید اور شاعری کے میدان میں بھی اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کر رہی ہیں۔ اس کے علاوہ برقی میڈیا سے وابستگی نے ان کے فن اور شخصیت میں ایک دانشورانہ رمق پیدا کر دی ہے جس کا مظاہرہ ان کی شاعری، افسانوں اور ناولوں میں کھل کر ہوتا ہے۔

جموں وکشمیر کے اکیسویں صدی کے ناول نگاروں میں ترنم ریاض کا نام بڑا معروف ومعتبر ہے۔ ترنم ریاض کا پہلا ناول ''مورتی'' ۲۰۰۴ء میں شائع ہو کر منظر عام پر آیا۔ یہ ناول ازدواجی زندگی کی ناکامی اور اس ناکامی کے اسباب پر مبنی ہے۔ اس ناول میں ایک تعلیم یافتہ اور خوبصورت مجسمہ ساز لڑکی ''ملیحہ'' کی کہانی پیش کی گئی ہے۔ جس کی شادی ایک کاروباری بدذوق انسان سے ہو جاتی ہے۔ لیکن ناول کا اختتام الم ناک انداز میں ہوتا ہے۔ ملیحہ کا شوہر بے حد دولت مند ہے وہ ملیحہ کے ظاہری حسن کو تو محسوس کرتا ہے مگر اس کے اندر کے فنکار کو پہچان نہیں پاتا۔ ملیحہ بے حد حساس اور نازک خیال ہے لیکن اس کے شوہر کے اندر جذبات اور احساسات کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔ ملیحہ فن کے اظہار اور اس کی نمائش کی راہ تلاش کرتی ہے اور گھر کے تہہ خانے میں مورتیاں خلق کرتی ہے۔ ترنم ریاض کا بیانیہ بے حد پُر تاثر اور تہہ دار ہے۔ ملیحہ کے لیے چھوٹی چھوٹی باتیں بھی بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ واقعات اور رشتے اس کو متاثر کرتے ہیں۔ اسی لیے ملیحہ بے حد جذباتی ہے لیکن اس کا شوہر بے حس ہے اس کے لیے جذبات و احساسات کی کوئی اہمیت نہیں۔ اُسے جو بھی چیز پسند آتی ہے اُسے خرید کر لے آتا ہے۔ وہ یہ سمجھنے کے لیے قاصر ہے کہ ہر چیز خریدی نہیں جا سکتی۔ خلوص، انسانیت اور محبت خرید وفروخت سے بہت بلند نعمتیں ہیں۔ اپنے شوہر کے رویے کی وجہ سے ملیحہ کے اندر کا فنکار رفتہ رفتہ ٹوٹا پھوٹا رہتا ہے۔ اس کی بنائی ہوئی مورتیوں کی طرح ترنم ریاض نے ناول کے آغاز میں ہی

استعاراتی انداز میں ''ملیحہ'' کے داخلی وجود کو بیان کر دیا ہے۔

''ٹوٹے ہوئے پنکھ والی فاختہ کے مجسمے کی چونچ ٹوٹ گئی تھی اور آنکھ کی
پتلی کی سیاہی غالباً بارش سے دھل گئی تھی............مرد کے مجسمے کا کندھا
ٹوٹ چکا تھا اور ٹوٹا ہوا کندھا حصّے کے ساتھ لگا رکھا تھا۔ ہرن کے بچے کا
داہنا کان آدھا ٹوٹا ہوا تھا............کتّے کی آدھی دم بھی ٹوٹ گئی تھی اور
اسی پتھر پر پڑی ہوئی تھی............سادھو کے سر کے اُوپر تراشا گیا جو
ٹوٹ چکا تھا اور پدم آسن میں مڑی ہوئی اس کی ٹانگوں کے قریب اس
کی گود میں پڑا تھا۔'' ؎

ترنم ریاض کا ناول ''مورتی'' پلاٹ اور مرکزی کرداروں کے علاوہ اپنے موضوع کو بھی عمدگی سے پیش کرتا ہے۔

ترنم ریاض کا دوسرا اہم ناول ''برف آشنا پرندے'' ۲۰۰۹ء میں شائع ہو کر منظر عام پر آیا۔ ترنم ریاض نے اس ناول میں کشمیر کی پانچ ہزار سالہ تاریخ کو سمیٹ کر کشمیر کی سماجی، معاشرتی اور ثقافتی زندگی کو پیش کیا ہے۔ ناول کشمیر کی سماجی تاریخ پر مبنی ہے۔ مصنفہ نے کشمیر کی صدیوں کی تاریخ کئی صفحات پر بیان کی ہے جس میں کشمیر کی شناخت، کشمیری افراد کے مصائب، کشمیر کی قدرتی خوب صورتی، کشمیر کے پکوان وغیرہ کو پیش کیا گیا ہے۔

ناول میں کشمیر کی تہذیبی تاریخ کا پس منظر خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار شیبا ایک دلچسپ کردار ہے۔ چونکہ ناول کا سارا منظر شیبا کے اردگرد پھیلا ہے اس لیے شیبا کے کردار میں یکسانیت پورے منظر میں دکھائی دیتی ہے۔ اس کے علاوہ ناول میں مصنفہ نے تاریخی حوالوں کا ذکر بڑی مشقت سے کیا ہے جو ناول کی خوبصورتی میں اضافہ کرتے ہیں۔ ترنم ریاض کا ناول ''برف آشنا پرندے'' ایک چمن کی مانند ہے جس کی سیر کر کے دل شاداں ہو جاتا ہے۔ اسی لیے اس ناول کو کئی ناقدین نے اکیسویں صدی کی پہلی دہائی کا اہم

ترین ناول قرار دیا ہے۔ ''برف آشنا پرندے'' کی موضوعاتی، فکری و ثقافتی انفرادیت کی بنا پر ترنم ریاض کا شمار بجا طور پر موجودہ دور کے نمائندہ ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔

آنند لہر:۔ اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں ریاست جموں وکشمیر سے تعلق رکھنے والے ناول نگاروں میں ایک اہم نام آنند لہر کا ہے۔ آنند لہر نے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا اور اب تک ان کے دس کے قریب افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں لیکن اس کے باوجود انہوں نے ناول نگاری کے میدان میں بھی قابل قدر کارنامے انجام دیے ہیں۔ پیشے کے لحاظ سے آنند لہر وکیل ہیں اور ناول نگار کی حیثیت سے ناول نگاری کے سلسلے کو آگے بڑھایا ہے۔

آنند لہر کا پہلا ناول ''سرحدوں کے بیچ'' ۲۰۰۱ء میں شائع ہو کر منظر پر آیا۔ اس ناول میں انہوں نے ہندوستان کی تقسیم اور سرحدوں کے دونوں جانب رہنے والے لوگوں کی دقتوں کا خلاصہ پیش کیا ہے۔ آنند لہر کے اس ناول کی اُردو کی ادبی دنیا میں کافی پزیرائی ہوئی۔ اس کے بعد ان کے تین ناول اور منظر عام پر آئے۔

آنند لہر کا دوسرا ناول ''اگلی عید سے پہلے'' ہے، یہ ناول ایک سو آٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس ناول میں کشمیر کی بدلتی ہوئی صورتِ حال کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ اس ناول میں آنند لہر نے کشمیریوں کی مذہبی رواداری اور اُن کی مہمان نوازی کا احاطہ پیش کیا ہے۔ اس ناول میں دو کرداروں عبدل اور بدری کے ذریعے کشمیریوں کے آپسی بھائی چارے کی وضاحت بھی کی گئی ہے اور ہندو، مسلم سکھ اتحاد کے نعرے کو ایٹم بم سے زیادہ طاقتور قرار دیا ہے۔ ''اگلی عید سے پہلے'' پلاٹ، کہانی، زبان و بیان، کردار نگاری، منظر نگاری اور مکالمہ نگاری کے لحاظ سے ایک عمدہ ناول ہے۔ ناول ''اگلی عید سے پہلے'' کی کہانی ختم ہونے پر خود قاری تلملا اُٹھتا ہے۔

آنند لہر کا تیسرا ناول ''مجھ سے کہا ہوتا'' میں آنند لہر نے جنگ کے اسباب، جنگ کی

تباہ کاریاں اور جنگ کے بعد ہولناک مناظر کی عکاسی کی ہے۔ناول ''مجھ سے کہا ہوتا'' میں پرندوں اور جانوروں کی زبانی تباہی و بربادی کے المیے کو پیش کیا گیا ہے۔ یہ ناول اصل میں امریکہ کی طرف سے بلاوجہ عراق پر حملے اور جنگ کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔اس ناول میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ کاروباری جنگ سے نہ صرف انسان تباہ ہوتا ہے بلکہ چرند، پرند اور روئے زمین پر پیدا ہونے والے نباتات، حیوانات اور ماحولیات کی بربادی بھی ہوتی ہے۔

آنندلہر کا چوتھا ناول ''یہی سچ ہے'' ۲۰۰۸ء میں شائع ہوا۔اس ناول میں انہوں نے زندگی کے حقائق کو فلسفیانہ انداز میں پیش کرنے کی سعی کی ہے۔اس ناول کو نہایت ہی موثر انداز میں پیش کیا ہے۔آنندلہر نے دو سگے بھائیوں شیو اور شنکر کے ذریعے امیری، غریبی، پاپ، سورگ، نرگ کا تصور اور ان دونوں بھائیوں کے درمیان تضاد اور کشمکش کی عمدہ تصویر کشی کی ہے۔ناول ''یہی سچ ہے'' دراصل زندگی کی سچائیوں کی بھرپور ترجمانی کرتا ہے زبان و بیان کے لحاظ سے یہ ایک عمدہ ناول ہے۔اس میں شک نہیں کہ آنندلہر کا مشاہدہ کیا ہے۔ان کی کہانیاں زندگی سے اتنی قریب ہوتی ہیں کہ ان کا شمار موجودہ دور کے اہم فکشن نگاروں میں ہوتا ہے۔

اس دوران نئی نسل کے کئی فنکار ناول نگار سامنے آرہے ہیں۔ان میں خمر مجید کے دو ناول ''یہ بستی یہ لوگ''، ''درد کا دریا''، ''پھوشن کا ناول ''صرف پانچ ہزار'' رشید پروین کے دو ناول ''دل اور دیا''، ''پیاسی پایل'' اور وحشی سعید ساحل کے ناول ''خون اور محبت''، ''منزل اور تلاش'' اور ''قحط'' منظر عام پر آئے ہیں۔

ان ناول نگاروں کا اپنا ایک الگ لکھنے کا انداز ہے۔ یہ کہیں رومان کی دھند میں لپٹی فضا کو پیش کرتے ہیں اور کہیں سماجی نابرابری سے پیدا شدہ مسائل کو اُبھارتے ہیں۔اکیسویں صدی کے یہ ناول نگار اپنے گردوپیش کی زندگی کا گہرا شعور رکھتے ہیں۔ان کے تجربے احساس کی آنچ سے پگھل کر لفظ و بیان میں ڈھل جاتے ہیں۔انہیں کشمیری عوام کی زندگی کا قریبی مشاہدہ ہے۔

غرض کہ اکیسویں صدی تک آتے آتے ریاست جموں وکشمیر میں اُردو افسانے کے ساتھ ساتھ اُردو ناول کے معیار و مزاج اور رفتار میں بھی تیزی اور تبدیلی آئی ہے۔ آج اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں یہاں اُردو ناول کی کیفیت اتنی مایوس کن نہیں ہے جتنی گذشتہ کچھ دہائیوں سے تھی۔

اُردو افسانہ :۔ جموں وکشمیر ایک طرف فطری حسن کی بنیاد پر ایک الگ مقام رکھتا ہے تو دوسری طرف اردو نثری ادب کے کئی معتبر قلم کار بھی رکھتا ہے۔ اپنے قدرتی مناظر کی دلفریبی و دلکشی کی وجہ سے دُنیا میں جہاں ارضی جنت کے نام سے معروف ہے وہیں ریاست جموں وکشمیر نے ادبی لحاظ سے بھی برصغیر ہندوپاک میں اہم مقام حاصل کیا ہے۔ موجودہ افسانہ نگاروں میں کئی نامور کہانی کار ہیں جن کی افسانہ نگاری کو ادبی حلقوں میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور آج بھی ان کا قلم خون جگر سے واردات قلب پیش کرنے میں مصروف ہے۔ آج اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں ریاست جموں وکشمیر میں اُردو افسانے کو بھی بڑے پیمانے پر فروغ دیا جارہا ہے۔ اور دوسری اصنافِ ادب کے مقابلے میں صنف افسانہ میں گراں قدر اضافہ کیا جارہا ہے۔ دورِ حاضر میں صنفِ افسانہ کی خون جگر سے سنچائی کرنے والوں میں نور شاہ، ترنم ریاض، حامدی کاشمیری، آنند لہر، خالد حسین، آمین بنجارا، ویدراہی، مشتاق احمد وانی، ولی محمد، حسن ساہو، ڈاکٹر ظہور الدین، ورنیدر پٹواری، جان محمد آزاد، مشراق مہدی، بشیر شاہ، خواجہ فاروق، غلام نبی شاہد، دیپک بدکی، زاہد مختار، شیام طالب، شیخ بشیر احمد، ذنفر کھوکھر، منصور احمد منصور، پرویز مانوس، سیدہ نکہت فاروق، مجیدار جمند، شیخ خالد کردار، مقبول ساحل، میر ایوب میر، ناصر ضمیر، ریاض توحیدی اور ملک ریاض فلک وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان افسانہ نگاروں میں بعض ایسے معتبر فن کار ہیں جو گذشتہ دو تین دہائیوں سے جموں وکشمیر میں اُردو افسانے کی نئی راہیں ہموار کررہے ہیں۔ لیکن اُن کا شمار آج بھی اکیسویں صدی کے نامور افسانہ نگار میں ہوتا ہے۔

نور شاہ کا شمار ریاست میں عہدِ حاضر کے نمائیدہ افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے اور اپنے

ہم عصروں میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔اس میں شک نہیں کہ جموں وکشمیر میں اُردو افسانے کے ابتدائی نقوش پریم ناتھ پردیسی اور محمد دین فوق ہیں لیکن افسانے کے پودے کی آبیاری کرنے والوں میں نور شاہ کا نام سرفہرست ہے۔اُنہوں نے اُردو افسانے کو مختلف رنگوں میں رنگا۔ اُنہوں نے جموں وکشمیر جنتِ بے نظیر کی ہر چیز مثلاً دریاؤں، جھلیوں، جھرنوں، آبشاروں، کی عکاسی کی اور ان کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا۔کشمیر کے حسن کے ساتھ ساتھ اُنہوں نے عصری حالات کو بھی اپنے افسانوں میں جگہ دی۔آپ کے افسانوں میں ہمیں شعری تخیل کے ساتھ ساتھ رومانیت کی لذت بھی ملتی ہے۔کشمیری سماج کی ہو بہو عکاسی کے علاوہ ان کے افسانوں کے کردار بھی اسی وادی سے تعلق رکھتے ہیں۔

نور شاہ کو زبان پر قدرت حاصل ہے جس طبقہ کے کردار کا انتخاب کرتے ہیں اُسی طبقے کی زبان بھی استعمال کرتے ہیں اور یہی ایک افسانہ نگار کا اور اس کے افسانوں کا ہنر اور حسن ہوتا ہے۔انہوں نے اپنے افسانوں کے علاوہ ناول اور ڈرامے بھی لکھے ہیں لیکن اُنہیں شہرت افسانوں کی وجہ سے ہی ملی۔اُنہوں نے اپنے بیشتر افسانوں میں جنسی کج روی کو موضوع بنایا ہے۔اُن کا خیال ہے کہ غلاظت کو چھپانے کے بجائے کریدنا اور صاف کرنا چاہیے بے شک اس سے بدبو پھیلتی ہے لیکن اس کے سوا چارہ نہیں۔ان کے یہاں جنسی موضوعات کو سمجھنے اور سلجھانے کا رجحان ملتا ہے جس سے یہ لگتا ہے کہ وہ سعادت حسن منٹو اور فرائڈ کے جنسی نظریات سے کافی متاثر رہے ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ ہمیں اُن کے افسانوں میں رومانیت اور حقیقت نگاری کا حسین امتزاج ملتا ہے جو اُنہیں اپنے دور کے دوسرے افسانہ نگاروں سے الگ کرتا ہے۔

نور شاہ کے اب تک سات افسانوی مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں ان افسانوی مجموعوں میں اُن کا سب سے پہلا مجموعہ ''بے گھاٹ کی ناؤ'' ہے اس میں کل دس افسانے ہیں۔ دوسرا ''ویرانے کے پھول'' اس میں بارہ افسانے ہیں۔ تیسرا مجموعہ ''گیلے پتھروں کی مہک''

ہے۔ چوتھا ''من کا آنگن اُداس اُداس'' اس میں چھ افسانے ہیں ۔ پانچویں ''ایک رات کی ملکہ'' اس افسانوی مجموعے میں گیارہ افسانے ہیں۔ چھٹا ''بے ثمر کا سچ'' جو ۲۰۰۵ میں ایک لمبے عرصے کے بعد منظر عام پر آیا اس میں بتیس افسانے شامل ہیں۔ آخری مجموعہ ''آسمان لہو اور پھول'' ۲۰۰۸ء میں شائع ہوا۔ اور نور شاہ کا افسانوی سفر ابھی بھی جاری وساری ہے۔ اُن کے افسانوی مجموعہ ''ویرانے کے پھول'' پر ریاستی سطح پر وزیر اعلیٰ جناب غلام محمد صادق نے انعام سے نوازا۔

آنند لہر کا اصلی نام شیام سندر آنند ہے اور ادبی دُنیا میں آنند لہر کے نام سے مشہور ہوئے ان کا تعلق بھی اسی سرزمین سے ہے جس سے چراغ حسن حسرتؔ، ٹھاکر پونچھی، اور کرشن چندر کا تعلق بھی رہا ہے۔ یعنی سرزمین پونچھ۔ آنند لہر پیشے سے ایک وکیل ہیں لیکن اپنی ادبی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ادبی دُنیا میں بھی اپنی حیثیت منوا چکے ہیں ۔ اردو نثر کی تقریباً تمام اصناف میں اُنہوں نے طبع آزمائی کی مثلاً ناول، افسانہ، ڈرامے وغیرہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ اُنہوں نے شاعری میں بھی طبع آزمائی کی مگر اُن کی شہرت کا باعث صرف افسانوی ادب ہی ہے۔

آنند لہر صوبہ جموں کے ایک مشہور افسانہ نگار ہیں جو نہ صرف ریاست بلکہ بیرون ریاست میں بھی اپنا لوہا منوا چکے ہیں۔ ان کے افسانے ملک کے اہم رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ آنند لہر نے زمانہ طالبِ علمی سے ہی اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ اُنہوں نے اپنی زندگی کا آغاز ۱۹۷۲ء میں اُس وقت کیا جب وہ ایک طالبِ علم تھے۔ اُن کا پہلا افسانہ ''پتھر کے آنسو'' ہے جس کی ادبی حلقوں میں کافی پذیرائی ہوئی۔ اس کے بعد اُنہوں نے متعدد افسانے، ڈرامے اور ناول لکھے اور کامیابی کی سیڑھیاں چڑھتے رہے۔

اگر کہا جائے کہ جموں وکشمیر میں تجریدی افسانے کی بنیاد آنند لہر نے ہی ڈالی تو بے معنی نہیں ہوگا۔ اس کے علاوہ اُنہوں نے علامتی افسانے بھی لکھے مگر علامتی افسانے ان سے پہلے بھی ریاست میں لکھے جا چکے تھے۔ تجریدی افسانے کے موجد جموں وکشمیر میں آنند لہر ہی

کہلائے۔ آنند لہر کا پہلا افسانوی مجموعہ ''سرحد کے اُس پار'' اس میں کُل ۱۴ افسانے ہیں۔ اس کا دیباچہ شرن کمار نے لکھا ہے ''سرحد کے اُس پار'' میں کہانی کار نے بڑی فنکارانہ طریقے سے تقسیم کے المیے کی عکاسی کی ہے۔ اس مجموعہ میں تقسیم سے پیدا شدہ حالات اور واقعات کی عکاسی بڑی خوبصورتی کے ساتھ آنند لہر نے کی ہے۔ ہر افسانے کا موضوع الگ اور اپنا مزاج رکھتا ہے۔ جہاں ایک طرف مصنف نے بلند پایہ نثری تحریر کا ثبوت دیا ہے وہاں دوسری طرف روایت سے قدرے ہٹ کر ہر افسانے میں مجموعی طور پر انسانی قدروں کی بازیابی، ہندو مسلم اتحاد، قومی یکجہتی، انسانی قدروں کے لئے جدوجہد، سماجی خلیجوں کو استوار کرنے کا جتن، زندگی کے سدھار کی کاوش، سماجی تنقید، سیاسی جادوگری اور جنسی موضوعات کے کاموش تاروں پہ مضراب پھیرنے کی صحت مند سعی بروئے کار لائی ہے۔ ملاحظہ ہوں افسانے کے چند اقتباسات۔

''ایک دن دونوں ملے تو گوپی نے روشن سے پوچھا۔ کس کس سرحد کو پار کرے کوئی فرقوں کی سرحد، مذہبوں کی سرحد، قوموں کی سرحد، لوگ ان سرحدوں کو مٹا کیوں نہیں دیتے؟ گوپی بولی۔ یہی بدقسمتی ہے، لوگ سرحدوں کو بدلتے ہیں، انہیں ختم نہیں کرتے، وہ جنگ لڑتے ہیں، خون بہاتے ہیں مگر پھر ایک نئی سرحد قائم کر لیتے ہیں''۔ ۸

''جب دونوں ملکوں کے لیڈر ملتے ہیں، فوجی ملتے ہیں، چور ملتے ہیں، اسمگلر ملتے ہیں، جج ملتے ہیں کھلاڑی ملتے ہیں تو عام لوگ کیوں نہیں مل سکتے؟''۔ ۹

افسانہ گوری کے چند اقتباس ملاحظہ ہوں:

''گوری برتن بناتی گئی اور روشن خریدتا گیا۔ برتن نہ ہندو ہوتے ہیں نہ مسلمان، یہ تو بس مٹی کے ہوتے ہیں۔ مٹی جس کا دھرم نہیں، مذہب

نہیں، یہ تو بس مٹی ہے، جہاں بھی ہے مٹی ہے''۔

''محبت کے ایک لفظ کے آگے مذہبی کتابوں کے فلسفے چھوٹے نظر آتے ہیں''۔ ۱۰

اس افسانوی مجموعے کے افسانوں میں اختصار، مقصدیت، معنویت، مشاہدے کی غیر معمولی گہرائی اور وسعت کا خصوصی طور پر ذکر ملتا ہے۔ سپیرین، گوری، شکست، پھول والی زندگی اس مجموعے کی بہت ہی عمدہ کہانیاں ہیں جو انسانی نفسیات کی ترجمانی کرتی ہیں۔

آنند لہر کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''انحراف'' ہے اس مجموعے میں زیادہ تر تجریدی افسانے ہیں۔ مختصر جملے اور حقیقت نگاری اس مجموعے کی اہم خوبی ہے۔ سماج اور زندگی کی باریک بینیوں پر آنند لہر کی گہری نظر ہے۔ وہ اشاروں اور کنایوں میں بڑی بڑی باتیں بیان کرتے ہیں۔ آنند لہر نے اپنے افسانوں میں سیاسی، سماجی نظام کی کمزوریوں کو بڑی بے باکی کے ساتھ دکھایا ہے۔ حقیقت نگاری اُن کے افسانوں کی جان ہے۔ مذکورہ مجموعے میں ۳۴ افسانے ہیں جو مختصر ہیں لیکن ان میں معنی خیزی ہے۔ فکر کی بالیدگی اور فن کی پختگی مختصر جملوں میں ڈھل کر افسانوں میں گہرائی و گیرائی پیدا کر دیتی ہے ان کے فقرے معنویت سے بھرپور ہوتے ہیں ملاحظہ ہوں چند اقتباسات۔

''کوئی بھی لڑنا نہیں چاہتا مگر جنگ پھر بھی جاری ہے''۔

(زاویہ) ''چاند کے سینے پے داغ ہے پر چاندنی تو بے داغ ہے''۔

(جواب)

''تمام ناموں، رشتوں اور ناطوں کا حاصل صرف تین لفظ ہیں، میں، تم اور وہ''۔ (وجود)

''ہر وہ چیز جو دوسروں کا بوجھ اُٹھاتی ہے اس کا اپنا بوجھ بھی اتنا ہی بڑھ جاتا ہے''۔ (گولائی)

''ایک بار اُس نے اُپر دیکھا تھا تو اس کی آنکھوں نے ستارے نوچ کر آسمان کو ننگا کرنے کی خواہش کی تھی''۔ (قیدی)

''تمہاری اس انگلی کا کیا ہوا جو تم نے آسمان کو چھونے کے لئے اپنے ہاتھ سے الگ رکھی تھی''۔(اندھی لکیریں) !!

آنند لہر کے ہاں زیادہ تر یہی نیا انداز کارفرما ہے۔ان کے افسانوں میں واقعات کی ترتیب، پلاٹ کی تعمیر اور کرداروں کے روائیتی ارتقاء کے بجائے منتشر خیالات، واقعات کو یکجا کر کے پیش کیا گیا ہے۔

افسانوں کے علاوہ اُنہوں نے بڑے اچھے ناول بھی لکھے ہیں۔ان کا پہلا ناول ''اگلی عید سے پہلے'' ہے جو ۱۹۹۷ء میں منظر عام پر آیا ۲۰۰۲ء میں اُنہوں نے ایک اور ناول ''سرحد کے بیچ'' لکھا اور ۲۰۰۹ء میں تیسرا ناول ''مجھ سے کہا ہوتا'' منظر عام پر آیا۔افسانے اور ناولوں کے علاوہ آنند لہر نے ڈرامے بھی لکھے ہیں ''نروان'' اُن کے ڈراموں کا مجموعہ ہے جس میں چھ خوبصورت ڈرامے ہیں۔

ریاست کی مشہور اور معروف تنظیم ''رسا جاودانی میموریل لٹریری سوسائٹی'' نے ۲۰۰۳ء میں رسا جاودانی میموریل لٹریری ایواڈ سے نوازا۔میر اکیڈمی لکھنو نے بھی انعام سے نوازا۔راجستھان اُردو اکیڈمی، جموں کشمیر اردو فورم، نمی ڈوگری سنستھا اور ادبی کنج نے بھی آنند لہر کو مختلف اعزازات اور انعامات سے نوازا ہے۔

اردو افسانہ نثری ادب میں سب سے زیادہ مقبولیت حاصل کرنے والی صنف ہے اور اکثر پڑھے لکھے اہلِ قلم حضرات اُردو افسانہ میں طبع آزمائی کرنا فخر سمجھتے ہیں۔جہاں تک ریاست کی خواتین افسانہ نگاروں کا تعلق ہے تو ان میں ایک ایسی افسانہ نگار کا نام سرفہرست ہے۔جو اپنے خونِ جگر سے اس صنف کو ترقی دے رہی ہیں۔

ترنم ریاض عالمی سطح کی ایک مشہور و معروف افسانہ نگار، شاعرہ، مترجم اور ناول

نگار ہیں انہوں نے ادبی دُنیا میں اپنی محنتی کاوشوں اور دلجوئی سے ایک مقام بنالیا ہے۔ ترنم صاحبہ نے گرچہ نثر کے مختلف شعبوں میں طبع آزمائی کی ہے لیکن بنیادی طور پر وہ ایک کہانی کار ہیں اور کہانی ان کا پہلا مشغلہ ہے۔ ان کے افسانے ادبی و معیاری ہونے کی وجہ سے ملک کے معروف و مشہور جرائد و اخبارات میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان کی تخلیقات کو دُنیائے ادب میں کافی سہرایا گیا ہے۔ ان کے اب تک چار افسانوی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں جو حسبِ ذیل ہیں۔

۱۔ ''یہ تنگ زمین'' ۱۹۹۸ء
۲۔ ''ابابیلیں لوٹ آئیں گی'' ۲۰۰۰ء
۳۔ ''یمبر زل'' ۲۰۰۴ء
۴۔ ''مرارخت سفر'' ۲۰۰۸ء

ترنم ریاض ایک دردمند دل رکھنے والی حساس اور ذہین خاتون افسانہ نگار ہیں جن کے افسانے دل پر ایک گہرا نقش چھوڑ جاتے ہیں۔ اُن کے افسانوں میں معاشرے میں ہونے والی ناانصافیوں، ظلم و جبر اور استحصال کی عکاسی خوب ملتی ہے۔ ان کے افسانوں کے کردار معاشرے کے وہ افراد ہیں جو ظلم و زیادتی اور ناانصافیوں کا شکار بنے اور غریب سے غریب تر ہوتے گئے مگر ان کی آہ و فریاد کسی نے نہ سُنی۔

عورت کو بھی ترنم ریاض نے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ جیسے مشہور ہے کہ زمانہء قدیم سے ہی عورت کے ساتھ ناانصافیاں ہوتی آئی ہیں اور ان ناانصافیوں کو افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ایسی بے شمار مثالیں ہیں۔ اس موضوع پر بھی ترنم ریاض نے بہت سی کہانیاں لکھی ہیں اور بتایا ہے کہ کس طرح ہمارے سماج میں عورت کے ساتھ ناانصافیاں ہوتی آئی ہیں۔ ان کی ہر تحریر میں ہمیں گھریلو ماحول اور معاشرے کا عکس دیکھنے کو ملتا ہے۔ افسانہ ''یہ تنگ زمین'' میں افسانہ نگار نے اپنی ماں کے تئیں بچوں سے محبت کو موضوع بنایا ہے۔

اس افسانے میں یہ بتایا گیا ہے کہ ایک ماں اتنا ہی پیار دوسرے بچوں کو دیتی ہے جتنا کہ اپنے بچوں کو کرتی ہے۔ ''پورٹریٹ'' ترنم ریاض کا ایک اور بہت مشہور افسانہ ہے۔ جس میں ساس اور بہو کے بیچ اختلافات کو موضوع بنایا ہے۔ اس افسانے میں یہ بتایا گیا ہے کہ ایک بہو ہمیشہ اس تاک میں رہتی ہے کہ اس کی ساس اس کو اپنا ہمراز بنائے اور دوسرے لوگوں کو باتیں نہ بتائے اور آپس میں ہی دونوں ہم راز رہیں مگر ایسا ہرگز نہیں ہوتا۔

ترنم ریاض کے یہاں عصری زندگی کی عکاسی، جدید تہذیب سے پیدا شدہ حالات اور مسائل کی نقاب کشائی بھی خوب طرح سے کی گئی ہے۔ وہ مختلف واقعات کو اپنا موضوع بنا کر قاری کو تحیر، تجسس، تازگی اور لطف ولذت عطا کرتی ہیں۔

ترنم ریاض صرف افسانہ نگاری ہی تک محدود نہیں رہی بلکہ انہوں نے ناول بھی لکھے ہیں۔ مجموعی طور پر یہ کہ انہوں نے ناول، افسانہ کے علاوہ شاعری اور ترجمہ نگاری میں بھی اپنا لوہا منوایا ہے۔ ان کا شعری مجموعہ ''پرانی کتابوں کی خوشبو'' ۲۰۰۵ء میں منظر عام پر آیا۔ ناول ''مورتی'' ۲۰۰۴ء میں اور دوسرا ناول ''برف آشنا پرندے'' ۲۰۰۹ء میں شائع ہوا۔ ترنم ریاض کا ایک تنقیدی مضامین ''چشن نقش قدم'' ۲۰۰۵ء میں شائع ہوا۔ ''بیسویں صدی میں خواتین کا اُردو ادب'' (تحقیقی وتنقیدی مضامین)، ''گوسائیس باغ کا بھوت'' (ترجمہ ہندی سے)، ''سنو کہانی'' (ترجمہ ہندی سے) اور ''ہاؤس بوٹ پر بلی'' (ترجمہ انگریزی سے) اہمیت کے حامل ہیں۔

خالد حسین اگر چہ پچھلی دو تین دہائیوں سے لکھ رہے ہیں لیکن اُن کا افسانوی سفر اکیسویں صدی کی پہلی اور دوسری دہائی میں ہنوز جاری وساری ہے۔ خالد حسین نے ادبی زندگی کا آغاز پنجابی زبان سے کیا۔ پنجابی میں اُن کے کئی مجموعے اب تک شائع ہو چکے ہیں مگر اُردو زبان میں بھی اُن کو برابر شہرت ملی۔ ۱۹۸۱ء میں خالد حسین صاحب کا پہلا اُردو افسانوی مجموعہ ''ٹھنڈی کانگڑی کا دھواں'' شائع ہوا۔ جس کی ادبی دُنیا میں کافی پزیرائی ہوئی۔ اس افسانوی مجموعہ میں دو کہانی بھی شامل تھی جس کی وجہ سے خالد حسین صاحب کو معطل کیا گیا تھا۔ خالد

حسین کے اس مجموعے ''ٹھنڈی کانگڑی کا دھواں'' میں کل ۳۳ کہانیاں ہیں۔اس مجموعے میں ایک کہانی ''گھر کی جنت'' کو چھوڑ کر تقریباً ۱۹۸۱ء سے پہلے کی کہانیاں اس مجموعے میں شامل کی گئی ہیں۔جن میں بیشتر پنجابی تخلیقات کا اُردو ترجمہ ہے اس مجموعہ ''ٹھنڈی کانگڑی کا دھواں'' میں ۱۴ کہانیاں خالد حسین نے اپنے پنجابی مجموعہ ''جہلم وگدا ریہا'' سے لی ہیں اور باقی ۱۹ تقریباً نئی تخلیقات ہیں۔ ''کھوکھلا سورج''، ''گھاس پر چلنا منع ہے''، ''گوری فصل کے سوداگر''، ''شمع ہر رنگ میں جلتی ہے'' کافی بہترین کہانیاں ہیں جن کو ادبی حلقوں میں کافی پذیرائی ہوئی تھی۔

پہلے افسانوی مجموعے کے دس سال بعد یعنی کہ ۱۹۹۱ء میں خالد حسین کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''اشتہاروں والی حویلی'' منظر عام پر آیا۔اس افسانوی مجموعے میں ۳۱ افسانے ہیں جن میں ''کنوار گندل''، ''بیڑے کی لنکا''، ''کھوکھلا سورج''، ''دیواروں چھپی واسنا''، ''پانی کی لکیرین''، ''مجاہد''، ''سیاست''، ''سورج کا گت''، ''ابابیل کا خواب''، ''علی بابا چالیس چور''، ''اندھیر نگری''، ''قیامت''، ''انتظار کا قیدی''، ''صلیبِ ذات''، ''بھوشیہ وانی''، ''نئے آدم کا خواب''، ''کارِ جہاں دراز ہے''، ''روحیں''، ''دشمنی''، ''گھاس پر چلنا منع ہے''، ''بابا نکی''، ''اپنا دامن اپنی آگ''، ''پتھریلے پانی میں بہتی ناؤ''، ''آوارہ سانپ کا ڈھنگ''، ''دشمن کون''، ''دل کی گلیاں''، ''گہرے پانیوں کا دُکھ''، ''کوئلہ بھئی نہ راکھ''، ''میری چادر میرے پیر'' شامل ہیں۔اس کے علاوہ اس افسانوی مجموعہ پر پیش لفظ اور تبصرے خالد کفایت، ڈاکٹر زینت اللہ جاوید اور ڈاکٹر اسد اللہ وانی نے کیے ہیں وہ بھی اپنی مثال آپ ہیں۔اس کے علاوہ خالد حسین نے خود اس افسانوی مجموعے میں ''میں اور میری تخلیق'' کے عنوان سے اپنے حالات اور بہت سی سچائیوں کو قلم بند کیا ہے۔جو اپنی طرح کی ایک منفرد بات ہے۔اس میں بہت سی ایسی باتیں جو عام ادیب بتانے سے گریز کرتے ان کو بھی خالد حسین نے منظر عام پہ لانے کی کوشش کی ہے۔مثلاً اپنی بیوی سے متعلق یوں رقمطراز ہیں۔

''میری بیوی صورت کی اچھی ہے، سیرت کی خوب ہے لیکن ایک ادیب

کے ناطے میں اس کے دماغ کی خوبصورتی کی تعریف نہیں کرسکتا اگرچہ
یہ جملہ اُسے ناگوار گزرے تو وہ مجھے معاف کردے۔'' ۱۲؎

اس طرح کی حقیقت کو قلم بند کرنا بڑی جرأت مندی کی بات ہے اس کے علاوہ اُنہوں نے اپنی افسانہ نگاری پر بھی تھوڑا تبصرہ کیا ہے جس کا کچھ حصہ ملاحظہ ہو:۔

''میری تخلیق کا خمیر سماج کے آٹے سے گندھا ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ادیب بنیادی طور پر سماج کا حصّہ ہوا ہے۔ وہ جو کچھ بھی لکھتا ہے سماج مین رونماں ہوئے واقعات، عوام کے اقتصادی وسیاسی مسائل اور دیگر حالات سے متاثر ہو کر لکھتا ہے۔ اس کی نظر گہری ہوتی ہے، وہ بات کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔'' ۱۳؎

''بیٹے کی لنکا''، ''پانی کی لکیریں''، ''دُشمن کون''، ''گوری فصل کے سوداگر''، ''اشتہارون والی حویلی''، ''کنوار گندل''، ''دیواروں میں چھپی واسنا' ، اس مجموعے کی بہترین کہانیاں ہیں۔ جن کو ادبی حلقوں میں کافی سراہا گیا۔ ڈاکٹر اسد اللہ وانی افسانوی مجموعہ'' اشتہاروں والی حویلی'' کے پیش لفظ میں خالد حسین کے بارے میں کچھ اس طرح سے اپنا تاثر بیان کرتے ہیں۔

''خالد حسین کے افسانوں میں نہ صرف حسن و جمال اور حقیقت ورومان کا امتزاج پایا جاتا ہے یا سماج میں پنپتے ناسوروں کی عکاسی کی ہے بلکہ کئی دوسرے مسائل کی نفسیاتی موشگافی، حق گوئی اور بے باکی سے بات کہنے کی جرأت مصلحانہ طنز، شگفتہ فقرے بازی، محاوروں کا برمحل استعمال اور کہیں کہیں ابہام بھی پایا جاتا ہے اور علامتی واستعارتی انداز بھی۔'' ۱۴؎

خالد حسین کی آخری تصیف ''ستی سر کا سورج'' ہے جو ۲۰۱۰ء میں منظر عام پر آئی۔

اس مجموعے میں ۲۰ افسانے، ایک انشائیہ ''ہاتھی اڈائی لاکھ کا'' اور ایک انشائیہ ''عشق نچائے تھیا تھیا'' شامل ہیں۔ اس افسانوی مجموعے کی ادبی حلقوں میں کافی پذیرائی ہوئی ہے۔ اس مجموعے میں وہ افسانہ بھی شامل ہے جو خالد حسین کا پہلا افسانہ ہے جو اُنہوں نے ۱۹۶۹ء میں لکھا تھا جس کا نام ''گھر کی جنت'' ہے۔ ''ستی سر کا سورج'' خالد حسین کا شاہکار افسانہ بھی اسی مجموعے میں شامل ہے جس کے نام پر اس مجموعے کا نام رکھا گیا۔ جس کو کچھ محقق اور نقادوں نے خالد حسین کا سب سے بہترین افسانہ کہا ہے۔

خالد حسین پنجابی اور اُردو دونوں زبانوں میں یکساں مہارت رکھتے ہیں اب تک اُن کی پنجابی اور اُردو کی مندرجہ ذیل تصانیف منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔

۱۔ ٹھنڈی کانگری کا دھواں ۱۹۸۱ء

۲۔ اشتہاروں والی حویلی ۱۹۹۱ء

۳۔ ستی سر کا سورج ۲۰۱۱ء

۴۔ جہلم وگدا ریہا ۱۹۷۶ء

۵۔ گوری فصل دے سوداگر ۱۹۸۲ء

۶۔ ڈونگے پانیاں دا دکھ ۱۹۹۳ء

۷۔ بلندی برف دا سیک ۲۰۰۵ء

۸۔ گواچی جھانجھر دی چیک ۲۰۱۰ء

۹۔ نوری رستماں ۲۰۰۹ء

۱۰۔ خالد حسین دا کتھا ساگر ۲۰۱۰ء

خالد حسین نے اپنے افسانوں ''بھوشیہ وانی''، ''نئے آدم کا خواب''، ''اندھیری نگری'' اور ''گھاس پر چلنا منع ہے'' میں موجودہ دور کی زندگی کی بے چینی، مفلسی، انتشار واضطراب، طبقاتی کشمکش، بیکاری اور جہالت کو علامتوں کے ذریعے اُبھارا ہے۔ لیکن وہ اس

میں پوری طرح سے کامیاب نظر نہیں آتے اس کے برعکس اُن کو اگر روایت پسند افسانہ نگار کہا جائے تو زیادہ موزوں رہے گا۔ بقول پروفیسر نصرت چودھری۔

''انہوں نے دورِ حاضر کے فرد کے داخلی احساسات اور محسوسات کو فکری سطح پر محسوس کیا اور مختلیف پیچیدہ نفسیاتی اور جنسی مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ ان کے ہاں زندگی کے خارجی مظاہر کی معرفت انسان کے داخلی، ذہنی، نفسیاتی تاثرات تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش بھی ملتی ہے۔ کہیں کہیں انہوں نے ابہامی اور علامتی طرز بھی اختیار کیا ہے۔ لیکن وہ اس میں پوری طرح کامیاب نہیں۔ وہ بنیادی طور پر روایت پسند افسانہ نگار ہیں۔ ۱۵؎

نصیر احمد قریشی المعروف امین بنجارا اُردو کے ایک ممتاز افسانہ نگار، تنقید نگار اور ادبی وسماجی کارکن کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ بطورِ ایک صحافی امین بنجارا کو کافی شہرت اور مقبولیت حاصل رہی ہے۔ آپ جموں وکشمیر کے کئی اخبارات اور رسائل سے منسلک رہے اور ریاست میں اُردو صحافت کی خدمت کرتے رہے۔ اس کے علاوہ امین بنجارا ریڈیو، ٹی۔ وی، تھیٹر سے بھی وابستہ رہے ہیں۔ ریاست جموں وکشمیر میں وہ اُردو فکشن، تحقیق وتنقید اور صحافت کے علاوہ ڈرامے کی دُنیا سے بھی وابستہ رہے ہیں۔ علمی ادبی اور سماجی خدمات کے اعتراف میں اُنہیں کئی انعامات واعزازات سے بھی نوازا گیا ہے۔ امین بنجارا کا ادبی سفر تقریباً تین دہائیوں پر مشتمل ہے۔ اس طویل عرصہ میں اُردو افسانے میں کئی ہئیتی اور موضوعاتی اعتبار سے تبدیلیاں رونماں ہوئیں۔ جن کا اثر اُن کے افسانوں اور دوسری تخلیقات میں ہمیں دیکھنے کو ملتا ہے۔ اُن کا اب تک ایک افسانوی مجموعہ منظرِ عام پر آیا ہے جس کا نام ''الاؤ'' ہے اور جو ۱۹۹۵ء میں منظر عام پر آیا۔ جن کی رسم اجراء ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے اپنے ہاتھوں سے کی تھی۔ چودہ کہانیوں پر مشتمل ان کا یہ افسانوی مجموعہ ہمارے سماج میں پھیلی ہوئی بدعنوانیوں، دھاندلیوں، فرقہ

وارانہ فسادات، اور انسانی زندگی کے عدم تحفظ کی نشاندہی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ ''الاؤ'' میں شامل افسانے ''جنم دن کا سندر پہاڑ''، ''امن کے لئے اجالا''، ''مکتی''، ''رب کی مار''، ''نکلا تیری تلاش میں''، ''آنسو چنار کے'' اور ''الاؤ'' اردو ادب کے سرمائے میں گراں قدر اضافہ کر تے ہوئے نظر آتے ہیں۔ امین بنجارا کے افسانوں میں کہیں کہیں ترقی پسند نظریے کی چھاپ بھی نظر آتی ہے وہ عام لوگوں پر ہو رہے ظلم وجبر اور زیادتیوں کو بھی اپنے افسانوں میں سمونے کی بھرپور کوشش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ فرقہ وارانہ فسادات، مذہبی ٹھیکیداروں اور سماج کی سربرائی کرنے والے مکار سیاست دانوں کے گھناونے چہرے کو بے نقاب کرنے کی کوشش اُن کے افسانوں میں نظر آتی ہے۔ جموں وکشمیر کی مشترکہ تہذیب کی عکاسی بھی اُن کے افسانوں میں ہوئی ہے۔

امین بنجارا نے تحقیق وتنقید کے حوالے سے بھی اچھا خاصا کام کیا ہے۔ اس کے علاوہ سوانح حیات پر ایک بہت ہی موثر کتاب ''گمنام شخصیت'' کے عنوان سے لکھی جس میں اُنہوں نے اپنے اُستاد ماسٹر موہن لال گپتا کی سوانح حیات قلم بند کی ہے۔ جو اپنے آپ میں ایک مکمل تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ امین بنجارا نے اُردو ادب کی نامور ہستیوں پر درجنوں تحقیقی وتنقیدی مضامین لکھے ہیں۔ جن میں محمد یوسف ٹینگ، پرتپال سنگھ بیتاب، وید بھسین، ابوالکام آزاد، سید قطب عالم شاہ سبزواری، پیر مٹھا، رسا جاودانی، جگن ناتھ آزاد، پروفیسر شہاب عنایت ملک وغیرہ وغیرہ پر کافی تحقیقی وتنقیدی مضامین لکھے ہیں۔ ان مضامین کے علاوہ امین بنجارا نے کئی کتابیں مرتب کی ہیں جو اُن کی نگاہ انتخاب اور تخلیقی شعور کی غمازی کرتی ہیں۔ امین بنجارا کی ان ادبی خدمات پر اُن کو ڈرامہ نگاری، انشاپردازی، اداکاری اور علمی، ادبی اور سماجی خدمات پر مختلف اداروں اور انجمنوں کی طرف سے متعدد بار اعزازت اور انعامات سے نوازا گیا ہے۔

ڈی۔ مینؔی کا شمار بھی اکیسویں صدی کے اہم افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کا پورا

نام خوش دیو مینیؔ ہے۔ یہ جموں وکشمیر کی وہ شخصیت ہیں جنھوں نے اُردو ادب کی تقریباً تمام اصناف میں طبع آزمائی کی اور بہت حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ اُنہوں نے تاریخ نگاری، صحافت، افسانہ نگاری، شاعری، انشائیہ نگاری وغیرہ تمام اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ خوش دیو مینی نے اُردو کے علاوہ پنجابی، ڈوگری، پہاڑی اور گوجری زبانوں میں افسانے لکھے اور شعر کہے ہیں۔ مینیؔ کے اُردو افسانوں کا پہلا مجموعہ ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا۔ جس میں دس کے قریب افسانے تھے۔ جن میں سیڑھیاں، عرفان، پہلا پتھر، چاند، نجات، ہوش مند، جشن، آخری تاریخ وغیرہ شامل ہیں۔

خوش دیو مینی نے اپنے افسانوں میں زندگی کو درپیش مسائل کی عکاسی بڑی خوبصورتی کے ساتھ کی ہے۔ انسانی زندگی کا احساس اُن کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ جو اُن کے افسانوں میں ہمیں ملتا ہے۔ مینیؔ کے افسانے معاشرے کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں اور دوسری طرف ہمارے سماج اور معاشرے میں بُرے رسم رواج پر بھی ایک طرح سے کھلی تنقید بھی کرتے ہیں۔ حقیقت نگاری اور سچائی کی منظر کشی اُنہوں نے اس طرح سے کی ہے کہ افسانہ پڑھتے وقت ایسا لگتا ہے کہ کوئی افسانہ یا کہانی نہیں بلکہ گاؤں کے کسی غریب گھر کا منظر ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ مینیؔ گاؤں میں پلے بڑھے لہذا ظاہر ہے کہ دیہاتیوں کی لاچاری، غربت اور بے بسی کی عکاسی اُن کے بغیر اور کوئی کیسے بہتر انداز سے کرسکتا ہے۔

نازنوشاد احمد خان مینیؔ کے بارے میں اپنے تاثر کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

> ’’خوش دیو مینیؔ کے افسانوں میں کرشن چندر کا افسانوی فن دکھائی دیتا ہے وہی سادگی، وہی ناز وادا، وہی جوش اور وہی دھڑکن ہے جو کرشن چندر کے نمائیدہ افسانوں میں موجود ہے۔‘‘ [۱۶]

کے۔ ڈی۔ مینیؔ کی زبان نہایت سادہ سلیس اور دلچسپ ہے اور یہی افسانے کی خصوصیات ہے جو اس کو دوسری اصناف سے الگ کرتی ہے۔ اُنہوں نے اپنے افسانوں میں

قدرتی مناظر کی تصویر کشی بڑی خوبصورتی سے کی ہے۔ مینیؔ نے زندگی کی جو تصویریں پیش کی ہیں وہ بالکل حقیقی اور فطری معلوم ہوتی ہیں۔ان کے زیادہ تر کردار دیہات سے تعلق رکھتے ہیں یعنی دیہاتی زندگی کے فرد ہیں۔

موجودہ دور کے افسانہ نگاروں میں ایک نام مشتاق احمد وانی کا ہے۔اُردو افسانہ نگاری میں انکی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ان کی شخصیت اپنے ادبی، سیاسی اور سماجی کارناموں کے باعث قائم رہی ہے اور آئیندہ بھی رہے گی۔بچپن ہی سے وہ کافی ذہین اور خوش اخلاق شخص تھے۔

پہلے شاعری کی طرف راغب ہوئے اور بعد میں نثر کی طرف بڑھے۔اب تک ان کے دو افسانوی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ پہلا افسانوی مجموعہ ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا جس کا نام ''ہزاروں غم'' ہے۔اس میں سولہ کہانیاں شامل ہیں۔اس افسانوی مجموعے کو ادبی حلقوں میں کافی شہرت حاصل ہوئی۔اس کے بعد ۲۰۰۸ء میں ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''میٹھا زہر'' کے عنوان سے منظر عام پر آیا۔اس افسانوی مجموعے میں کل بارہ کہانیاں شامل تھی۔یہ افسانوی مجموعہ پہلے افسانوی مجموعے سے بالکل الگ ہے۔یہ افسانوی مجموعہ تقریباً تمام بڑے فکشن کے اہم نقادوں کی نظر سے گزرا ہے اور تمام افراد نے اس کا جائزہ لیا اور اپنے اپنے تاثرات پیش کیے ہیں۔

مشتاق احمد وانی کے افسانوں کا جائزہ لینے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اُنہوں نے اپنے گردونواح کی زندگی کے حوادث اور واقعات کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔اُنہوں نے گھسے پٹے موضوعات پر افسانے نہیں لکھے بلکہ نئے موضوعات کو اپنانے کی کوشش کی ہے۔انسانی زندگی کی عکاسی وہ بڑی بے باکی کے ساتھ کرتے ہیں۔سیدھی سادھی زندگی کی کہانی کو وہ بڑے موثر انداز کے ساتھ سادہ پلاٹ اور سادہ زبان میں پیش کرتے ہیں۔ان کے افسانوں میں ہمیں اپنی جموں وکشمیر کا عکس نظر آتا ہے۔یہاں کا موسم، یہاں کی بہاریں، یہاں

کی افراتفری ان کے افسانوں میں ہمیں ملتی ہے۔ سیدھی سادھی زبان میں بہت بڑی بات کہنے کا ہنر مشتاق احمد وانی کو خوب آتا ہے اور یہی بات افسانے کے حسن کو دوبالا کر دیتی ہے۔
مشتاق احمد وانی ریاست جموں وکشمیر کے وہ نوجوان ادیب ہیں جنہوں نے قلیل مدت میں ریاست کے ادبی حلقوں میں اپنی الگ شناخت بنائی ہے۔ ان کے افسانوں سے متعلق نامور نقاد پروفیسر گوپی چند نارنگ یوں رقمطراز ہیں۔

''ڈاکٹر مشتاق احمد وانی ایک مدت سے کہانیاں لکھ رہے ہیں۔ وقتاً فوقتاً ان کی کہانیاں میری نگاہ سے گذرتی رہتی ہیں وہ ایک درد مند اور احساس طبعیت رکھتے ہیں۔ وہ کشمیری اہل زبان ہیں لیکن اُردو میں بھی ان کی پیٹھ مادری زبان سے کم نہیں۔ ان کی اُنگلیاں معاشرے کی نبض پر ہیں اور ان کی کہانیاں آج کے مسائل کے گرد گھومتی ہیں۔ وہ افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک تنقید نگار اور محقق بھی ہیں ان کی ان تصانیف میں ''تقسیم کے بعد ناول میں تہذیبی بحراں'' جو ۲۰۰۲ء میں منظر عام پر آئی اور دوسری '' آئینہ آئینہ'' ۲۰۰۴ء میں شائع ہوئی۔ ان کی دوسری تصانیف میں اعتبار و معیار، شعور بصیرت اور اُردو ادب میں تانیثیت منظر عام پر آ کر یہ ثابت کرتی ہیں کہ وہ تحقیق اور تنقید کا بھی شعور رکھتے ہیں۔ اب تک مشتاق احمد وانی کی ان کوششوں سے اُردو ادب میں گراں قدر اضافہ ہوا ہے۔''[۱۷]

ہر بجن سنگھ ساگر کی اُردو ادبی زندگی کا باقاعدہ آغاز اُس وقت ہوا جب اُنہوں نے اپنی پہلی کہانی ''فرشتہ'' ۱۹۶۲ء میں لکھی۔ یہ کہانی سرینگر ٹائمز میں ۱۹۶۲ء میں چھپی اس کہانی کی ادبی حلقوں میں کافی پذیرائی ہوئی۔ اس کے بعد اُنہوں نے ایک سے بڑھ کر ایک اچھی کہانیاں لکھیں جن میں ''حملے''، ''فرض''، ''عشق کے پیچ وخم''، ''فرزند''، ''پتھر کی حفاظت میں''،

''اگر فردوس برروئے''، ''دوتصوریں ایک روح''، ''راہ گیر کی لالٹین''، ''دو پیاسی آنکھیں'' ہیں جو کافی معیاری اور بہترین کہانیاں ہیں۔ان کی یہ کہانیاں ملک کے کئی نامور اُردو رسائل اور جرائد کی زنیت بنی۔ جن میں ''پتھر کی حفاظت'' لکھنو کی میگزین ''کتاب'' میں ''اگر فردوس برروئے'' حیدرآباد کی میگزین قلم کار میں ''دوتصویریں ایک روح'' ملک کے مشہور ومعروف میگزین بیسویں صدی میں ''راہ گیر کی راتیں'' شبِ خون میں چھپی۔اس کے علاوہ ۱۹۷۳ء میں نور شاہ نے ایک کتاب مرتب کی تھی جس کا نام ''انتخابِ اُردو ادب'' تھا اُس میں ہربجھن سنگھ ساگر کی کہانی ''دو پیاسی آنکھیں'' بھی چھپی تھی۔اپریل ۱۹۷۰ء میں امام مرتضےٰ نقوی نے ایک تحقیقی کتاب ''اُردو ادب میں سکھوں کا حصّہ'' لکھی تھی جس میں ان کی ایک کہانی ''دو تصویریں ایک روح'' کو شامل کیا گیا تھا۔

اس کے علاوہ ہربجھن سنگھ ساگر پنجابی کے بھی بہت بڑے قلم کار ہیں۔پنجابی میں اب تک ان کے تین افسانوی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔جن میں ''دائرہ'' ۱۹۷۹ء میں دوسرا ''یاتری'' ۲۰۰۳ء میں اور تیسرا ''بند دروازے دا پرتانت'' ۲۰۰۹ء میں شائع ہوا۔ہربجھن سنگھ ساگر کی ان ادبی خدمات پر اُنہیں دو بار کلچر اکیڈمی سے پنجابی سائیتہ سبھا سرینگر، پنجابی، لٹریری انجمن (Punjabi litrary organ,zation) پٹیالہ سے اور شری متی میلا دیوی کی طرف سے متعداد بار اعزازات اور انعامات سے نوازا گیا ہے۔

اکیسویں صدی کے افسانہ نگاروں میں ذنفر کھوکھر کا نام اہمیت کا حامل ہے اُن کے اب تک تین افسانوی مجموعے منظر عام آچکے ہیں ''خوابوں کے اُس پار'' ذنفر کھوکھر کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے یہ مجموعہ پریس کلب جموں کے زیر اہتمام ۱۹۹۹ء میں شائع ہوا۔اس افسانوی مجموعہ میں کل تیس افسانے شامل ہیں حصہ اول کے چودہ افسانوں کا رنگ مزاحیہ ہے جب کہ حصہ دوم کے سولہ افسانوں کے موضوعات سنجیدہ ہیں۔اس افسانوی مجموعے میں شامل افسانے ''مدہوش''، ''گھر پیارا گھر''، ''انتخاب''، ''ہم ہندوستانی ہیں''، ''یوں بھی ہوتا ہے''، ''نصیحت''، ''جوابی کاروائی''، ''ہمارے ماسٹر جی''، ''عزت کا سوال''، ''چکری''، ''اہلیہ محترمہ''،

''پہلی ہی نظر میں''، ''گذشتہ راصلوۃ''، ''پرنسپل صاحب''، ''خوابوں کے اُس پار''، ''ایک چھوٹی سی لڑکی''، ''بے بسی''، ''دردِ نہاں''، ''تشویش''، ''گھر''، ''بڑی بہو''، ''رعایت''، ''نسخہ''، ''وہ''، ''دربہ''، ''حسن سلوک''، ''ایس۔ٹی''، ''ایک انسان''، ''پچھتاوٗ'' اور ''اے جانِ ناتواں'' ہیں۔ان افسانوں میں کچھ افسانے فن کے معیار پر پورے اُترتے ہیں اور بعض فنی اور تکنیکی لحاظ سے اتنے اچھے افسانے نہیں ہیں۔

ذنفر کھوکھر کے افسانوں کا جائزہ لیتے وقت قاری کو اس بات کا ہر دم احساس ہوتا ہے کہ ذنفر کھوکھر مشرقی عورت ہونے کے ساتھ ساتھ ایسے علاقے سے تعلق رکھتی ہیں جہاں آزادی کے ساٹھ سال کے بعد بھی ماڈرن زندگی کی رمق دکھائی نہیں دیتی اتنا ہی نہیں بلکہ اس افسانوی مجموعے کو پڑھنے سے اس بات کا بھی پتا چلتا ہے کہ جب یہ افسانوی مجموعہ تخلیق ہوا۔ اس وقت مصنفہ کے علاقے میں زندگی کی بنیادی ضروریات جیسے بجلی اور پانی، ہسپتال اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے کالج اور یونیورسٹیاں بھی نہیں ملتی تھیں۔افسانہ نگار نے اس محدود ماحول میں رہ کر بھی خوبصورت افسانے تحریر کئے ہیں جن میں انکے مشاہدے سے زیادہ ان کے مطالعے کا عمل دخل ہے۔''خوابوں کے اُس پار'' پر اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے ڈاکٹر ظہور الدین لکھتے ہیں۔

> ''یہ صحیح ہے کہ ابھی ذنفر کھوکھر کی تحریر میں وہ مقناطیسیت تو پیدا نہیں ہوئی جس کے بغیر فن کار کو حیاتِ دوام حاصل نہیں ہوتی لیکن خوش آئندہ بات یہ ہے کہ اس مقناطیسیت تک پہنچنے کے لئے جس بنیادی جوہر کی ہر فن کار کو ضرورت ہوتی ہے یعنی تخیل کی بے پایانی اور فکر کی جولانی، یہ دونوں عناصر ذنفر کے قلم کو قدرت نے کماحقہ عطا کئے ہیں۔'' [۱۸]

''کانچ کی سلاخ'' ذنفر کھوکھر کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ہے جس کی اشاعت پر لیس کلب جموں کے زیر اہتمام ۲۰۰۱ء میں ہوئی۔یہ افسانوی مجموعہ ۲۰۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس افسانوی مجموعے میں کُل چھبیس افسانے شامل ہیں۔جن میں سترہ سنجیدہ افسانوں کے علاوہ

نومزاحیہ افسانے بھی شامل ہیں۔ یہ افسانوی مجموعہ پہلے افسانوی مجموعہ ''خوابوں کے اُس پار'' کے چار سال بعد منظر عام پر آیا۔ اس افسانوی مجموعہ کے سنجیدہ افسانوں کی فہرست میں ''چارسیکنڈ ہینڈ''، ''خواب''، ''کانچ کی سلاخ''، ''حادثہ''، ''یہ دنیا اگر مل بھی جائے تو کیا ہے''، ''خاموشی''، ''یادیں''، ''''پانچ سوروپے'' اور ''تلقین'' شامل ہیں اور مزاحیہ حصے میں ''باتیں کچھ راتوں کی''، ''خود کردہ را چار انسیت فہم کا اپنے مقصود تھا''، ''آس کا دامن''، ''صندوق''، ''حکمنامہ''، ''ریزوریشن''، ''خواب نہیں''، ''دیکھا کرو'' اور ''گالی'' افسانے شامل ہیں۔ اس افسانوی مجموعے میں ذنفر کھوکھر نے اپنے گردو پیش ہونے والے واقعات و حادثات کا اثر قبول کر کے اور اچھے بُرے لمحوں کے کھیل تماشوں کا گہرائی سے مشاہدہ کر کے انسانی فطرت کے رموز واسرار کی گرہوں کو کھولنے کی سعی کی ہے۔

''عبرت'' ذنفر کھوکھر کا تیسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ یہ افسانوی مجموعہ ۲۰۱۰ء میں منظر عام پر آیا۔ اس میں ۲۰۵ صفحات ہیں۔ اس افسانوی مجموعے میں کل پچیس (۲۵) افسانے شامل ہیں جو ان کے فن اور صلاحیت کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ اس افسانوی مجموعہ میں مصنفہ نے زیادہ حقیقت نگاری سے کام لیا ہے۔ ''عبرت'' میں شامل افسانوں کو پڑھ کر لگتا ہے کہ ذنفر کھوکھر نے اپنے ذاتی تجربے اور واقعات کے نقشے کو قاری کے سامنے رکھنے کی کوشش کی ہے اور کامیاب بھی ہوئی ہیں۔ ان کی کہانیاں سماج کے مختلف رنگوں کی آئینہ دار ہیں۔ ''دہشت گردی''، ''بربریت''، ''اغوا''، ''بے چارگی''، ''بےبسی''، ''گھٹن''، ''خوف''، ''غصہ''، ''لوٹ کھسوٹ''، ''حراستی''، ''ہلاکتیں''، ''ضمیر فروشی'' وغیرہ ایسے عوامل ہیں جو ذنفر کھوکھر کی گرفت میں آنے کے بعد افسانوں کے موضوع بن جاتے ہیں۔ سرحدی علاقوں میں فوج، پولیس، خفیہ ایجنسیوں اور دیگر حفاظتی دستوں کی طرف سے بے گناہ اور معصوم لوگوں کے ساتھ اُن کا برتاؤ، آتش زنی، املاک تباہی، قتل وغارت، فرضی جھڑپوں میں انسانی جانوں کا زیاں، اخوانی (جعلی ملی ٹینٹ، جو فوج کی پناہ میں رہتے ہیں اور ان کی ہدایت پر کارروئیاں کرتے ہیں) مجاہدوں کے ہاتھوں روزانہ کی ذلت ورسوائی، عصمت دری اور دوسری طرف ہمسایہ ملک کی جانب سے

آہٹ ترتیب یافتہ ملی ٹینٹوں کا عوام پر مظالم ڈھانا اور نقلی مجاہدوں کے بھیس میں نقلی دہشت گردوں اور غنڈہ عناصر کا غریب اور لاچار لوگوں کو تنگ کرنا، غرض عوام کا اس دودھاری دہشت گردی کا مسلسل شکار ہونا ایسا پس منظر ہے جس میں ذنفر کھوکھر کے افسانوں کی تشکیل ہوتی ہے۔ ان موضوعات پر ذنفر کھوکھر کے افسانے خون رلاتے ہیں اور لگتا ہے اس حساس خاتون افسانہ نویس نے لہو میں قلم ڈبو کر لکھا ہے۔

ذنفر کھوکھر چونکہ ہمارے افسانہ نگاروں کی جدید تر نسل سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس لئے وہ ایک نئی فکر ایک نئی سوچ کی ترجمانی کرتی ہیں۔ ان کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ اپنے افسانوں میں کشمیر کی سماجی، معاشرتی اور انسانی زندگی کے مختلف رشتوں کی عکاسی کرتی ہیں۔ ان کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کے ذہن کی لکیر روشن ہے اور وہ اس روشنی میں بہت کچھ دیکھ لیتی ہیں اور پھر اپنے پڑھنے والوں کو بھی ذہنی طور پر اس روشنی سے ہم کنار کرتی ہیں۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں معاشرے کے حسن و جمال، رعنائیوں اور رنگینیوں سمیت معاشرتی اونچ نیچ، درد و کرب اور حقائق کو آئینہ دکھانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ کم و بیش پندرہ سال کی ملی ٹینسی کی شب و تار میں پوشیدہ بہت ساری کہانیوں کو اُجال کر عبرت کا سمان مہیا کیا ہے۔ درحقیقت پندرہ سال کے اس عبوری دور کی پہنائیوں میں جو واقعات و حوادث پنہاں ہیں انہیں حقیقت کا پیکر عطا کرنے کے لیے فنی مہارت کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کی باریکیوں پر بھی مکمل دسترس کی ضرورت ہے۔ ذنفر کھوکھر کو وہ فنی مہارت حاصل ہے۔

شیخ بشیر احمد اور غلام نبی شاہد بھی کافی عرصے سے لکھ رہے ہیں لیکن اُن کے افسانہ رسائل و جرائد میں کم ہی چھپتے ہیں۔ شیخ بشیر احمد نئی نسل کی بے راہ روی کا ذکر اکثر اپنے افسانوں میں کرتے ہیں۔ ''مٹھی سے بھاگا پرندہ'' ان کا افسانی مجموعے کا نام ہے۔ غلام نبی شاید کی کہانیاں ان کے الگ اندازِ بیان کی آئینہ دار ہیں۔ مشتاق مہدی ایک سنجیدہ افسانہ نگار ہیں۔ اُن کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''آنگن میں وہ'' اکیسوی صدی میں ہی شائع ہوا ہے۔ ان کے اکثر افسانے ہماری آج کی زندگی سے جڑے ہوئے مسائل و معاملات کا تجزیہ پیش کرتے ہیں۔

ریاست جموں و کشمیر سے تعلق رکھنے والے نئے افسانہ نگاروں کے بارے میں نور شاہ اپنی کتاب ''جموں کشمیر کے افسانہ نگار'' میں لکھتے ہیں۔

''ریاست جموں و کشمیر سے تعلق رکھنے والے نئے نام سامنے آرہے ہیں اور یہ لوگ افسانوی ادب کے فروغ کے لیے کافی محنت کررہے ہیں۔ افسانوی دنیا میں ان کا نام روشن نظر آرہا ہے۔ ان میں پرویز مانوس، ڈاکٹر اشوک مشتاق احمد کینی، مقبول ساحل، پیارے ہتاش، مجیدار جمند، ریاض توحیدی، میر ایواب میر، خالد کرار اور ملک ریاض فلک پیش پیش ہیں۔'' ۱۹

پرویز مانوس کا افسانوی مجموعہ ''شکارے کی موت'' منظر عام آچکا ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں طبقاتی کشمکش اور ان سے پیدا ہونے والے مسائل کی عکاسی اپنے انداز سے کرتے ہیں۔ ''کچھ لمحے کچھ سائے'' ڈاکٹر اشوک پٹواری کا افسانوی مجموعہ ہے۔ ان کے اکثر افسانوں میں ہاسپٹل (اسپتال) کا موحول ملتا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ ایسا موحول ان کے پیشے سے منسلک ہے۔ میر ایوب میر اپنے افسانوں کے ذریعہ معاشرہ کو بدلنے کی وکالت کرتے ہیں۔ ''ٹھنڈی آگ'' کے بعد ان کا ایک اور افسانوی مجموعہ ''اور پھر ایک دن'' شائع ہو چکا ہے۔ مجیدار جمند کے کہانیوں کی زبان رواں دواں ہے۔ ''ابابیلوں کی بستی'' ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔

ڈاکٹر ریاض توحیدی کے افسانوں میں کشمیر کا درد و کرب، خون خراب اور ٹوٹتی ہوئی زندگی کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ ''کالے دیوؤں کا سایہ'' اُن کا افسانوی مجموعہ حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ مشتاق احمد کینی اپنے افسانوں میں عوام دوستی اور انسان دوستی کی تابناک تصویریں پیش کرتے ہیں۔ ان کا افسانوی مجموعہ ''غافل'' کے عنوان سے منظر عام پر آیا ہے۔ خواتین میں سیدہ نکہت فارق کا افسانوی مجموعہ ''قہر نیلے آسمان کا'' ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں وادی کے حالات کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ وہ شاعرہ بھی ہیں۔

نسرین نقاش بنیادی طور پر یہ بھی شاعرہ ہیں لیکن انہوں نے آہستہ آہستہ افسانے کی طرف بھی توجہ دی ہے اور قاری کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کر رہی ہیں۔ عصرِ حاضر میں ریاست جموں وکشمیر کے اُردو افسانے پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر قدوس جاوید اپنے ایک مضمون ''آج کا کشمیر اور اُردو افسانہ'' میں لکھتے ہیں۔

''اکیسویں صدی میں تیسری دنیا کے ممالک، مثلاً کینیا اوگانڈا، سوڈان، فلسطین، افغانستان وغیرہ (black Literature) اور ہندوستان میں دلت لٹریچر کے حوالے سے یہ تصور بھی عام ہو رہا ہے کہ ''کاغذ اور زمین'' پر الگ الگ چہروں کے ساتھ جینا منافقت ہے۔ اگر یہ مفروضہ قابل ہو تو آیئے اب کشمیر کے ماضی قریب کے ادبی سرمایہ کے اندر جا کر اپنے قلم کاروں کے تخلیقی رویوں کو سوچ لیں۔ ہم گئے ....اور واپس آئے۔ ۹۰-۱۹۸۹ء کے بعد کے کڑے وقتوں کے زیر سایہ بلوغت حاصل کرنے والے ''حال'' کے افسانہ نگاروں کے افسانوں کو ہم میں سے نور شاہ، محمد یوسف ٹینگ، آثاری اور غلام نبی خیال نے دیکھا پرکھا اور پایا کہ ''کرب حاضر کے رمز شناس ان افسانہ نگاروں کے افسانوں میں سچ ہے اور سچ کے سوا کچھ نہیں'' اور ایسا اس لیے ہے کہ یہ افسانے کشمیر کی عصری زندگی کے کلیدی استعاروں، گولی، چیک آوٹ، گرینیڈ دھماکہ، تلاشی، بنکر اور کرفیو وغیرہ کو گرفت میں لے کر بُنے گئے ہیں۔ غلام نبی، شاہد، مشتاق مہدی، ریاض توحیدی، ایثار کشمیری، پرویز مانوس، ناصر ضمیر، ڈاکٹر نیلوفر ناز، عبدالرشید راگیر لداخی وغیرہ کے افسانوں میں عمر مجید، نور شاہ، اشرف آثاری، خالد حسین، حسن ساہو، عبدالرشید شیخ، شبنم قیوم، دیپک بدکی اور دیپک کنول، زاہد مختار وغیرہ معتبر افسانہ نگاروں کی طرح تجلیات کلیم کی ضیا پاشیاں اور مشاہدات

حکیم کی گل افشانیاں تو نہیں لیکن یہ بات طئے ہے کہ گذشتہ دو ڈھائی دہائیوں میں کشمیر جو کچھ ہوا، ہو رہا ہے ان سب کی اصلیت کا اندازہ نئی نسلوں کے افسانہ نگاروں کے افسانوں میں بیان کردہ سچائیوں کی تہوں اور طرفوں کو کھولنے کے بعد ہی لگایا جا سکتا ہے۔'' [۲۰]

حواشی

۱۔ خواجہ احمد عباس، بحوالہ ڈاکٹر برج پریمی، جموں وکشمیر میں اردو ادب کی نشو ونما، ۲۰۰۴ء، ص ۴۳۔
۲۔ برج پریمی، جموں وکشمیر میں اردو ادب کی نشو ونما، ص ۴۳۔
۳۔ ایضاً، ص ۴۶۔
۴۔ اعجاز صدیقی، ماہنامہ شاعر، ناولٹ نمبر، ص ۳۹۔
۵۔ نورشاہ، نورشاہ کے تین ناولٹ، ص ۸۳۔
۶۔ ایضاً۔۔۔۔ ص ۸۴۔
۷۔ ترنم ریاض، فریب خطِ گل مورتی، امیکس بکس، سرینگر ۲۰۰۹ء ص ۸۵۔
۸۔ آنند لہر، سرحدوں کے اس پار، سیمانت پرکاش، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲، ص ۱۲
۹۔ ایضاً، ص ۱۵۔
۱۰۔ ایضاً، ص ۳۱۔
۱۱۔ آنند لہر، انحراف، ملک بک ڈپو ترکمان گیٹ، دہلی۔ ص ۲۱، ۱۶، ۴۱، ۵۶، ۵۷
۱۲۔ خالد حسین، اشتیہاروں والی حویلی، ص ۴۰۔
۱۳۔ ایضاً، ص ۴۱۔
۱۴۔ ایضاً، ص ۴۸۔
۱۵۔ نصرت چودھری، شیرازہ، جموں وکشمیر میں اردو کے پچاس سال، جلد ۴۷، ص ۲۴۰۔
۱۶۔ نازنوشاد احمد خان مینیؔ، خوش دیو مینیؔ، ایک شخصیت ایک تعارف، ص ۲۔
۱۷۔ مشتاق حمدوانی، میٹھا زہر ۲۰۰۸ء، ص ۸۔
۱۸۔ ڈاکٹر ظہورالدین، خوابوں کے اس پار، ص ۷۔
۱۹۔ نورشاہ، جموں وکشمیر کے اردو افسانہ نگار، ص ۳۳۔
۲۰۔ ایضاً، ص ۳۶۔

جموں وکشمیر میں غیر افسانوی ادب

(۲۰۰۰ تا ۲۰۱۳ء)

جموں وکشمیر میں اکیسویں صدی کے پہلے عشرے میں غیر افسانوی ادب کے مقابلے افسانوی اور شعری ادب کی طرف زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ چند گنے چُنے لوگوں نے غیر افسانوی نثر کو فروغ بخشا ہے۔ یوں تو غیر افسانوی ادب کے زمرے میں انشائیہ، خاکہ، سفرنامہ، خودنوشت اور مکتوب وغیرہ سب کچھ آتے ہیں لیکن اس دہائی میں غیر افسانوی ادب کی جس صنف کو شعوری یا غیر شعوری طور فروغ ملا وہ اُردو خودنوشت ہے۔ جموں وکشمیر میں اکیسویں صدی کی جن سوانحی عمریوں کو مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی اُن میں ''یادوں کے چراغ''، ''کچھ تو لکھیئے کہ لوگ کہتے ہیں''، ''ولر کے کنارے''، ''یادوں کے لمس وغیرہ اہمیت کی حامل ہیں۔

یادوں کے چراغ:۔ ''یادوں کے چراغ'' ڈی ڈی ٹھاکور کی خودنوشت ہے۔ جو ۲۰۰۶ء میں منظر عام پر آئی۔ ۱۰۲ ابواب اور ۴۷۵ صفحات پر مشتمل یہ کتاب سیاسی اور تاریخی دستاویز کہی جاسکتی ہے۔ اگر چہ یہ خودنوشت اُردو میں شائع ہونے سے پہلے انگریزی میں Mylife and years in kashmir Polilics کے نام سے شائع ہوئی تھی لیکن ٹھاکور

صاحب کو اُردو کے ساتھ بچپن سے ہی رغبت رہی جس کی وجہ سے آپ نے اپنے تلخ وشریں واقعات ومشاہدات کو عوامی سطح تک پہنچانے کے لئے اردو زبان کو ہی ذریعہ اظہار بنایا۔ آپ نے اُردو اور ریاستی عوام سے اپنی محبت اور لگن کا اظہار بڑی خوبصورتی سے کیا ہے۔

''چونکہ ریاست میں اُردو سرکاری زبان کا درجہ رکھتی ہے اور ساتھ ہی ریاست کا بیشتر آبادی کا حصہ اس زبان میں مہارت رکھتا ہے۔ اس لیے یہ خودنوشت مجموعہ الموسوم ''یادوں کے چراغ'' اُردو خواندہ قارئین کی نظر کیا جارہا ہے''۔ [۱]

ٹھاکور صاحب کا جنم ۹ دسمبر ۱۹۲۹ء میں ضلع ڈوڈہ میں بٹرو کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ہوا۔ اپنے بچپن کے تجربات ومشاہدات کے ساتھ ہی مصنف اپنے گاؤں کا جغرافیائی اعتبار سے ایسا نقشہ کھینچا ہے کہ قاری اپنے آپ کو مذکورہ جگہ پر محسوس کرنے لگتا ہے۔ بٹرو، مگرکوٹ، نیل، رام بن وغیرہ کی سماجی زندگی کا بھی اُنہوں نے بہت ہی عمدہ طریقے سے تذکرہ کیا ہے۔

ڈی ڈی ٹھاکور نے اپنے خاندان کا ذکر بھی تفصیل سے کیا ہے۔ اپنے والد ٹھاکور موتی رام اپنے کردار، ایمانداری اور غیر جانبدارانہ خصوصیات کی بنا پر پورے علاقے کے پنچوں میں مشہور تھے۔ والدہ شریمتی دوپتی دیوی والد کی تیسری بیوی تھی کیونکہ اس سے پہلے دو بیویوں کی وفات ہو چکی تھی۔ ٹھاکور صاحب کے بڑے بھائی بھگیلا رام کی پیدائش کے وقت ان کی پہلی سوتیلی ماں کی وفات ہوئی اور دوسری ماتا دیو کی دیوی، رام داس کی پیدائش کے چند سال بعد اس دنیا فانی سے رحلت فرما گئیں تھی۔ والد موتی رام کے کردار اور شخصیت کو مصنف نے بڑی فنی پختگی سے سامنے لایا ہے۔

چار برس کی عمر میں مصنف کو گاؤں کے پرائمری اسکول میں داخل کروایا گیا۔ پہلے ہی دن اُردو قاعدہ سے تعلمی سفر کی ابتدا ہوئی۔ ان کو خاندانی ورثے میں یہ شوق ملا تھا۔ شاید یہی

وجہ ہے کہ یہ وراثت سے جڑا ہوا شوق ہی انہیں اپنی خودنوشت کو اُردو میں بھی شائع کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔اس کے بعد اُنہوں نے پرائمری اسکول بانہال اور ہائی اسکول اودھم پور سے بھی اپنی تعلیم مکمل کی۔ اعلیٰ تعلیم ایس۔ پی کالج سرینگر اور دو سالہ قانون کی ڈگری لکھنؤ یونی ورسٹی سے حاصل کی۔

شری پرتاپ سنگ کالج سرینگر میں دورانِ تعلیم ہی مصنف کو کشمیر کی سیاست اور سماجی صورتِ حال کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ آہستہ آہستہ اُنہوں نے شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ سے اپنے اچھے تعلقات بھی استوار کر لیے۔ ٹھاکور صاحب نے کشمیر کی سیاست کا اس قدر باریک بینی سے مشاہدہ اور تذکرہ کیا ہے جس سے ڈوگرہ شاہی حکومت کی اصلی کارکردگیاں مانند تصور سامنے آجاتی ہیں۔

ڈی ڈی ٹھاکور نے قبائلی حملے کے وقت مہاراجہ کی ہجرت سے متعلق بھی کچھ معلومات خودنوشت میں درج کی ہیں۔اکتوبر ۱۹۴۷ء کے پہلے ہی ہفتے میں قبائلی حملوں کی خبریں اور رپورٹیں آرہی تھیں۔ حالانکہ مہاراجہ کے پاس یہ خبر پہنچ گئی تھی اور یوں مہاراجہ نے اس کو قابلِ غور ہی نہیں سمجھا۔ ہندوؤں کا ایک وفد سرینگر سے مہاراجہ کے پاس پہنچا تاکہ وہ مہاراجہ کو حملے کی خبر دے لیکن مہاراجہ نے ملنے سے انکار کر دیا اور وفد مایوس ہو کر واپس لوٹ آیا۔ حملے کے دوران مہاراجہ کشمیر سے بھاگ کر جموں چلے آتے ہیں۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مہاراجہ بزدلی سے اور اپنی رعایا کو مصیبت میں چھوڑ کر اپنی جان بچانے میں لگ گئے۔اس حرکت سے کشمیری عوام کو مہاراجہ سے کوئی ہمدردی نہ رہی اور یوں لوگوں نے ان کو بزدل، وادی کشمیر اور عوام سے بے وفائی کرنے والے حکمران کی نظر سے دیکھنا شروع کر دیا۔

''اس کے بعد لوگ مہاراجہ کو ایک بزدل اور وادی کے لوگوں سے بے
وفائی کرنے والے کہے جانے لگے۔ یہ دلیل پیش کی جانے لگی کہ ایک
حکمران کے لیے اس سے زیادہ قابلِ نفرت بات کیا ہو سکتی ہے کہ وہ

اپنے لوگوں کو ایک ایسے نازک وقت میں چھوڑ کر جائے جبکہ لوگوں کو اُمید تھی کہ وہ محاذ پر جا کر ہر خطرے کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنی جان کی قربانی دیں گے۔'' ۲

مہاراجہ کے بعد کسی بھی قسم کی حکومت باقی نہ تھی۔ نیشنل کانفرس کے کارکنوں نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی اور تمام انتظامیہ نیشنل کانفرس کے لیڈروں کے ماتحت تھا۔ ٹھاکور نے بیرونی ممالک کا دورہ بھی کیا جن میں لبنان، یونان، اٹلی، پیرس، لندن، جرمنی، اسٹریم ہا لینڈ، سوئزرلینڈ وغیرہ ہیں۔ ان ممالک میں مصنف کے جتنے بھی شب و روز گزرے ہیں ان کا تفصیلی بیان ہمیں ''یادوں کے چراغ'' میں ملتا ہے۔ روزمرہ کے معمولات اور سیر و سیاحت کے دوران اپنے مشاہدات اور تجربات کے ساتھ وہاں کی عوامی زندگی اور طرزِ معاشرت کو بھی بڑی بے باکی اور خوبصورتی سے تحریر کیا ہے۔

ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی آمد و جانشینی کی جنگ کو بھی اس خودنوشت میں موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔ فاروق عبداللہ نے جے پور میڈیکل کالج سے ایم بی ایس کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے برطانیہ چلے گئے اس سے قبل وہ گورنمنٹ ہسپتال میں بحیثیتِ ڈاکٹر کام کر چکے تھے۔ بیماروں اور تیمارداروں سے ان کے ہمدردانہ سلوک قائم تھے۔ بجائے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے فاروق عبداللہ نے برطانیہ میں ایک ہسپتال میں کام کرنا شروع کر دیا اور وہیں ایک نرس مسز مولی سے شادی کر لی۔ بیرونی ممالک سے واپسی کے بعد شیخ صاحب فاروق کو شیرِ کشمیر انسٹی چیوٹ آف میڈیکل سائنسز کا ڈائریکٹر بنانا چاہتے تھے لیکن فاروق نے اس سے انکار کر دیا کیونکہ وہ اپنے آپ کو کشمیر کا ولی عہد حکمران تصور کرتا تھا۔ قلم بند تاثرات سے اندازہ ہوتا ہے کہ شیخ صاحب نے حقیقت میں اس چیز کو محسوس کیا تھا کہ میرا بیٹا اس عہدے کو سنبھالنے میں لاپرواہ ہے۔ شیخ عبداللہ خود اپنے بیٹے فاروق عبداللہ کو جانشین بنانے پر خوش نہیں تھے۔ اُنہوں نے خود اس کا اعتراف کیا ہے جب فاروق کو کابینہ میں شامل

کیا گیا تھا۔

''اُنہوں نے مجھے بتایا کہ میں نے فاروق کو کابینہ میں شامل کیا ہے لیکن مجھے یقین نہیں کہ میں اپنے فیصلے میں صحیح ہوں۔ میری تمنا ہے کہ کاش میری پسند کا جانشین ہوتا جو میں نے آج کیا ہے اس سے میں خوش نہیں ہوں۔ چند دن پہلے جب میں شدید بیمار تھا وہ معمولی بہانہ بنا کر بنگلور جانا چاہتا تھا جبکہ آپ یعنی ٹھاکور صاحب نے اس کو جانے سے باز رکھا۔ اُنہوں نے وقت کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے جی ایم شاہ کے کان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''اس گھر میں کل تک جو چہل پہل تھی وہ ختم ہوگئی۔ اب سارے راستے کو پکار روڈ کو جاتے ہیں۔ فاروق کا مکان گپ گار روڈ پر تھا۔'' ۳؎

مذکورہ اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ عبداللہ اپنے بیٹے فارق عبداللہ کی کارکردگیوں سے خوش نہیں تھے اور نہ ہی ان کو اپنے بیٹے پر پورا یقین اور اعتماد تھا۔ جانشینی کے سلسلے میں بھی اپنی مرضی سے ہی قدم اُٹھانا چاہتے تھے لیکن حالات اور وقت کے ساتھ ساتھ شیخ صاحب کو اپنی دل خواہشات کا گلہ گھونٹنا پڑا۔ جانشینی کے بعد فاروق عبداللہ کا واحد مقصد اپنے والد کے وزیروں سے چھٹکارا حاصل کرنا تھا۔

خودنوشت ''یادوں کے چراغ'' میں مصنف نے اپنی علالت کا بڑا دردناک ذکر کیا ہے۔ اکثر ان کو آئی سی یو اور سی سی یو میں رکھا گیا۔ حالت زیادہ ابتر ہوگئی تو کئی مرتبہ ہیموڈائی لیسس بھی کروایا گیا۔ کتاب کے آخری حصے میں اُنہوں نے اپنے تاثرات قلم بند کیے ہیں جن میں ان کا زندگی سے متعلق نظریہ، مذہب کے متعلق ان کا رویہ، انسانی فطرت، دنیاوی قوانین اور اپنے ذاتی مشاہدات اور محسوسات کو بھی ضبطِ تحریر میں لایا گیا ہے۔

مجموعی طور پر ''یادوں کے چراغ'' میں ڈی ڈی ٹھاکور نے اپنی زندگی کے نجی

واقعات ومشاہدات کے ساتھ ہی اپنے تجربات کو بھی پیش کیا ہے۔ اپنے تعلمی سفر میں آبائی گاؤں، بانہال، ایس پی، کالج سرینگر، لکھنو یونی ورسٹی کے گزشتہ دنوں کو بڑے ہی عمدہ پیرایۂ اظہار اور خوش اسلوبی سے تحریر کیا ہے۔ خودنوشت میں ریاست کی سیاست کا اس قدر تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے کہ شاید ہی ریاستی سطح پر سیاسی معلومات کی کوئی دوسری کتاب فراہم کر سکے۔ گو یا خودنوشت ذاتی تحریر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک تاریخی دستاویز بھی کہی جاسکتی ہے۔

کچھ تو لکھیے کہ لوگ کہتے ہیں:۔ آغا اشرف کی خودنوشت ہے جو ۲۰۰۹ء میں شالیمار آرٹ پریس سرینگر سے شائع ہوئی۔ اگرچہ اس خودنوشت کو اشرف کے عزیز شاگرد سید حبیب نے ترجمہ کر کے اُردو زبان میں شائع ہونے کے مرحلے تک پہنچایا ہے۔ اس خودنوشت سے قبل ہی سید حبیب صاحب نے اپنے استاد (آغا اشرف) کی سوانحی عمری ''راہنما'' کے عنوان سے لکھی تھی۔

اشرف صاحب نے یہ خودنوشت باضابطہ طور پر نہیں لکھی بلکہ اُن کے ایک عزیز کے کہنے پر وہ اس کو کیسٹ میں ریکارڈ کر کے محفوظ کر لیتے تھے اور یوں یہ برقی مواد کتابی صورت میں اُردو زبان کی وساطت سے شائع ہوتا ہے۔

خودنوشت ''کچھ تو لکھیے کہ لوگ کہتے ہیں'' کے کل گیارہ ابواب اور ۳۲۳ صفحات ہیں۔ یہ خودنوشت سوانح عمری ایس پی کالج سے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، یورپ اور امریکہ میں تسلیم وتربیت کے دلکش تجربات وواقعات کی داستان ہے۔ اپنی اعلیٰ تعلیم کے دوران وہ ڈاکٹر ذاکر حسین سے بہت متاثر ہوئے۔ اُنہوں نے ذاکر صاحب کی طبیعت، شخصیت اور علم وآگہی سے بہت فیض حاصل کیا۔ اشرف صاحب ذاکر حسین کو اپنا رول ماڈل مانتے ہیں۔ یہاں تک وہ ان سے اتنے متاثر ہو چکے تھے کہ عاشقی کا بھوت اپنی سحر انگیزی میں گرفتار کرنے لگا۔

''ذاکر صاحب نے اپنے بولوں سے مجھ پر عاشقی کا سحر پھینک دیا تھا
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں اُن دنوں کری لحاظ سے میں، اسکول میں،

کالج میں، سماج میں، مذہب میں جو کچھ ہو رہا تھا، مجھ پر اثر انداز ہو رہا تھا"۔[۱۲]

خود نوشت کا پہلا باب "آغاز اور بڑھتی ہوئی زندگی" کے عنوان سے قائم کیا گیا ہے۔اس باب میں مصنف نے اپنے بچپن کے مشاہدات اپنے خاندان کے تمام افراد کی علم پروری اور ان کے عہدوں سے متعلق گفتگو کی ہے۔اشرف صاحب کی شخصیت پر دادا اور نانا کی شخصیت کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔دادا مغربی طرز کے شوقین اور نانا مشرق و مغرب کا دل کش امتزاج تھے۔آغا اشرف کا تعلق ایک جاگیردارانہ خاندان سے تھا۔اُنہوں نے اپنے خاندان کی جاگیردارانہ شان و شوکت، وضع قطع اور ٹھاٹھ باٹھ کو بھی سامنے لانے کی سعی کی ہے۔

اشرف علی نے اپنے بچپن، ابتدائی تعلیم، جائے پیدائش اور تاریخ پیدائش سے متعلق کوئی بھی معلومات فراہم نہیں کی ہے۔البتہ اپنی پیدائش سے متعلق وہ صرف اتنا لکھتے ہیں کہ ۱۹۴۱ء میں جبکہ عمر کی پہلی دہائی سے ہی گزر رہا تھا۔مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین سے ذہنی ونفسیاتی ٹکراؤ کا حادثہ پیش آیا۔اگر وہ ۱۹۴۱ء میں عمر کی پہلی دہائی سے گزر رہے تھے تو ان کی عمر تقریباً دس برس ہو سکتی ہے تو یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کی پیدائش ۱۹۳۱ء کا زمانہ گزر چکا تھا اور میری عمر تقریباً گیارہ سال کی تھی۔اس لحاظ سے سن پیدائش ۱۹۳۰ء ٹھہرتا ہے۔ان دو بیانات کی بنیاد پر ہم ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۱ء کے درمیانی عرصے کو ہی ان کی پیدائش کہہ سکتے ہیں۔اس کے علاوہ اپنے بچپن، بھائی، والدہ، بچپن کے دوست واحباب، مکتب، ابتدائی تعلیم وغیرہ کا کہیں بھی کوئی سراغ نہیں ملتا ہے۔اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اشرف صاحب نے اپنے بچپن کے شب و روز اور ابتدائی تعلیم کو نظر انداز کیا ہے۔اس کے ساتھ ہی مصنف نے اپنی والدہ محترمہ بیگم ظفر علی کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے حالانکہ وہ اپنے وقت کی معزز شخصیات میں شمار ہوتی تھیں اور اُنہوں نے ریاستی اور ملکی سطح پر سرکاری عہدوں پر کام کیا ہے لیکن اشرف صاحب نے اس کتاب میں ان کے تذکرے میں ورق سیاہ نہیں کیا ہے۔

مصنف نے اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں بیرونی ممالک کی سیر بھی کی اور اُنہوں نے مغربی تہذیب کا بڑی گہرائی سے مشاہدہ بھی کیا۔ مغربی تہذیب کی کھوکھلی شان و شوکت پر اُنہوں نے طنز بھی کیا ہے۔ مغربی ممالک میں امریکہ اور یورپ جیسے ملکوں کی عصر حاضر کی تہذیبی قدروں کا زوال آمادہ تصویر کو اُنہوں نے بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ قتل، خودکشی، طلاق، بے رحمی اور عصمت ریزی اور شخصی آزادی کے نام جسم فروشی اور بے حیائی وغیرہ پر ہوئے دل کے تاثرات سامنے لائے ہیں۔ اس کے علاوہ امریکی سماج میں غریب رعایا سے جو بھاری تعداد میں ٹیکس وصول کیے جاتے تھے اس سے امیر اور غریب کے درمیان ایک خلا بن چکی تھی۔

ملٹری جی، جے ہند کے عنوان سے مصنف نے کشمیری پنڈتوں کے دلوں کی حقیقت بیان کی ہے۔ جموں وکشمیر میں جب سے ہندوستان و پاکستان اور چینا کی طرف سے تعینات فوج کے دبدبے سے عوام کے دلوں میں ایک خوف بیٹھ گیا ہے۔ ۱۹۴۷ء کا واقعہ ہے جب پہلی بار ہندوستانی فوج اور فوجی افسر باریک تر بند گاڑیوں میں گذر رہے تھے۔ شیخ صاحب کو کشمیریوں نے لارڈ کرشنا کہا۔ کشمیری پنڈتوں نے فوج کو دیکھ کر نعرے لگائے ''جے ہند'' مہاتما گاندھی کی جے، پنڈت نہرو کی جے، لیکن یہی خوش ہونے والے کشمیری پنڈت فوج کے تسلط سے اس قدر خوف زدہ ہو گئے کہ ان کے دل کے اندر ایک احساس کمتری پیدا ہو گیا اور فوج کے ڈر سے جلدی جلدی صرف ملٹری جی کے الفاظ نکلتے ہیں۔ ایک کشمیری پنڈت نے چاہا کہ وہ فوجی افسر کو اپنے گھر چائے پلائے مگر پنڈت جی کو معلوم نہیں کہ اس کو کس طرح بلایا جائے کیونکہ کشمیر جنتِ بے نظیر میں امن و خوشحالی تھی اور جنت میں فوجی تسلط کا دبدبی کیا معنی رکھتا ہے۔

> ''جب ۱۹۴۷ء میں ہندوستانی فوج کشمیر میں داخل ہوئی تو ایک فوجی حبہ کدل کے اوپر نمودار ہوا، گشت کرنے لگا۔ ایک کشمیری پنڈت نے اسے ذرا دور سے دیکھا اور چاہا کہ فوجی کو چائے پلائے مگر پنڈت کو کو

معلوم نہیں تھا کہ اسے کس طرح پکارے۔فوجی سے ڈر کر اس کی زبان
سے چیخ سی آواز نکلی۔'ملٹری جی'' ڈی پی در صاحب ہمیں محفوظ کرانا
چاہتے تھے۔اسے کیا معلوم تھا کہ ملٹری جی کا ڈرامہ کشمیر میں کتنے کھیل
کھلے گا۔'' ۵

اگر چہ مصنف نے اپنی زندگی کے کچھ واقعات اور حقائق کو نظر انداز ضرور کیا ہے مگر جو کچھ اُنہوں نے ضبطِ تحریر میں لایا وہ خودنوشت کے بنیادی اصولوں پر پورا اُترتا ہے۔حقیقت گوئی کو خودنوشت کا اصلی جز مانا جاتا ہے۔اُنہوں نے اپنے نانا کے ساتھ بچپن میں برانڈی لی تھی۔حالانکہ وہ اس کے عادی نہیں تھے بلکہ وہ جوڑوں کے درد کو دور کرنے کے لئے برانڈی استعمال کرتے تھے۔آخری حصے میں اشرف علی نے اپنی معلومات اور مطالعہ شدہ کتابوں کا ذکر کیا ہے۔

مجموعی طور پر اشرف علی نے یہاں اپنی ذاتی زندگی کے واقعات و مشاہدات اور دوست واحباب کا تذکرہ کیا ہے وہیں اُنہوں نے اپنی تعلیم کے دوران جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی اور امریکہ ویورپ کے تعلیمی اداروں اور سماجی سطح پر مطالعہ و مشاہدہ کیا ہے۔مغرب کی کھوکھلی تہذیب پر طنز، کشمیری عوام پر فوج کا تسلط، شیخ محمد عبداللہ اور جموں وکشمیر میں سیاسی بیداری، آزاد کشمیر، جامعہ ملیہ میں معزز شخصیات سے روابط اور علی گڑھ میں سیاسی لہر، گاندھی جی، نہرو اور آزاد کی سیاسی بصیرت پر تفصیلی گفتگو، اپنے خاندان کی جاگیردارانہ شان وشوکت، وضع قطع اور ٹھاٹھ باٹھ، دادا اور نانا کی مغربی اور مشرقی طرزِ شخصیت کی مماثلت اور تضاد، دوست واحباب اور آخری حصے میں اسلامی نقطہ نظر سے اپنے ذاتی مشاہدات اور محسوسات وغیرہ کو بہت ہی فنکارانہ طریقے سے پیش کیا ہے۔

وُلر کنارے:۔سید علی شاہ گیلانی کی آپ بیتی ''وُلر کنارے'' ۱۷۵ صفحات اور ۸۹ ابواب پر مشتمل ہے۔یہ کتاب ۲۰۱۰ء میں مرکزی مکتبہ تحریکِ حُریت حیدر آباد، سرینگر سے

اشاعت پذیر ہوئی۔ مصنف کی پیدائش سے لے کر ۱۹۷۰ء تک کے عرصے پر محیط ہے۔ وُلر ایشیا میں اپنے میٹھے پانی کی بدولت مشہور ہے۔ گیلانی صاحب نے بچپن، لڑکپن اور جوانی میں اس سے فیض اُٹھایا اور اس کا حق ادا کرنے کے لیے ہی اُنہوں نے اپنی بیتی کا عنوان ''ولر کنارے'' رکھا۔ ان کی ولادت ۲۹ ستمبر ۱۹۲۹ء کو تحصیل بانڈی پورہ میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم پرائمری اسکول بوٹینگو، سوپور سے حاصل کی۔ اس کے بعد اُنہوں نے اورینٹل کالج لاہور سے عالم اور کشمیر یونیورسٹی سے فاضل اور منشی فاضل کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ۱۹۴۹ء میں بحیثیت استادان کا تقرر ہوا اور ۱۹۵۰ء میں ان کے والدین نے زور منزل سے سوپور ہجرت کی۔ سرکاری طور پر گیلانی صاحب نے ایک ایماندار معلم کی حیثیت سے تقریباً بارہ برس تک وادی کشمیر کے مختلف تعلیمی اداروں میں درس و تدریس کے بفرائض انجام دیے۔ ۱۹۵۳ء میں گیلانی جماعتِ اسلامی سے وابستہ ہوئے اور سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے کر وہ اسی تنظیم کے لیے کام کرنے لگے۔ ۱۹۶۲ء میں پہلی بار گرفتار ہوئے اور تقریباً تیرہ مہینے کی مسلسل قید و بند میں زندگی گزارتے رہے۔ ''وُلر کنارے'' کئی اعتبار سے ایک اہم مرتبہ رکھتی ہے۔ انسان کو حالات کے ساتھ لڑنے اور اپنی ہمت، حوصلہ اور عزم و استقلال پر قائم رہ کر ایک نئی دنیا تعمیر کرنے کا حوصلہ بھی دیتی ہے۔ گیلانی صاحب نے بچپن میں بہت ہی تنگ دستی کی زندگی گزاری ہے لیکن کبھی اپنے حوصلے کو پست نہیں ہونے دیا۔ تعلیمی ذوق کو ہر حال میں قائم رکھا۔ یہاں تک کہ اُنہوں نے خود کہا کہ میں نے بہت ہی سخت کوشش کا سامنا کیا ہے اور محنت کا دامن کبھی نہیں چھوڑا۔ غربت نے ایسا غلبہ ڈالا کہ کئی بار سرینگر کی گلیوں میں امانی مزدوری بھی کی اور پتھر بھی ڈھوئے۔ کپڑے کے بنڈل اُٹھا کر پھیری بھی کی۔

خود نوشت میں گیلانی نے کئی فرشتہ صفت مسلمانوں کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ جنہوں نے قبائلی حملے کے دوران اپنے ہمسایہ سکھ اور ہندو بھائیوں کی جان و مال کے تحفظ میں ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ سکھ اور ہندو بیٹیوں اور بہنوں کو اپنے گھروں میں پناہ دی اور اسلمی اصول و

ضوابط کی پاسداری کی اور ایک سچے انسان دوست ہونے کا ثبوت بھی فراہم کیا ہے۔

کشمیر کے مشہور مورخ محمد دین فوق اگرچہ بڑے عالم تھے لیکن گیلانی صاحب کے ساتھ جو سلوک اُنہوں نے کیا اس کو وہ زندگی بھر نہیں بھول پائے ۔ حصول تعلیم کے سلسلے میں جب لاہور جاتے ہیں تو فوق نے بجائے تعلیم کے زیور سے آراستہ ہونے کا موقع فراہم کرنے کے ان کو کوئی اور ہی کام سونپ دیا جو گیلانی کو اپنے گھر سے دوری اور مجبوری کے سبب کرنا پڑتا ہے اور وہ کام تھا فوق کی بیٹی کے گھر نوکر بن کر رہنا۔ حالانکہ فوق نے یہ وعدہ کیا تھا کہ اس لڑکے کو میں اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور خوب پڑھاؤں گا۔ گیلانی صاحب کا کہنا ہے کہ میرے تصور میں بھی نہیں تھا کہ وہ اپنے قول وفعل سے مکر جائیں گے۔ اس سے گیلانی کا تڑپنا اور بے بسی کے عالم میں آنسو بہانا بھی ایک پُرسوز واقعہ ہے۔

> ''مرحوم فوق صاحب نے مجھے اپنے ساتھ لیا...... مرحوم کے ساتھ اوڑی کے راستے سے مظفر آباد پھر راولپنڈی اور وہاں سے ریل کے ذریعے لاہور پہنچ گئے ۔ دوسرے ہی دن اُنہوں نے کسی مدرسے کی طرف جانے کے بجائے اپنی بیٹی کے گھر پہنچا دیا۔ جو نر ینگ میں سکونت پذیر تھی ۔ اور مجھے یہ احساس ستائے جا رہا تھا کہ میں اسکول سے اُٹھائے جانے کے بعد گھریلو نوکر بنا دیا گیا ہوں۔'' ۶

''یک لخت غافل گشتم وصد سالہ راہم دور شد'' کے عنوان سے گیلانی نے شیخ محمد عبداللہ کی سیاسی پالیسیوں پر طنز کیا ہے۔ اگر چہ اس وقت ریاست میں ڈوگرہ حکومت کا بول بالا تھا لیکن ۱۹۴۷ء میں جب ملک تقسیم ہو گیا ہوا اور چار سو یعنی جونا گڑھ، حیدرآباد اور پھر جموں و کشمیر میں خاص کر مسلم کا قتل عام ہوا ان واقعات کی سہی تصویر کشی کی گئی ہے۔

آپ بیتی عوامی زندگی کی تفصیلات کے ساتھ ساتھ نجی زندگی کی جھلک بھی پیش کرتی ہے۔ گیلانی صاحب ایک شفیق باپ، ایک نیک شوہر اور اپنے والدین کے تابعدار فرزند ہونے

کے علاوہ اپنے بھائی بندوں، رشتہ داروں، ہمسائیوں کے حق سے بھی نا آشنا نہیں ہیں۔ بلکہ وہ ہر لحاظ سے اپنے فرائض انجام دینے میں کوشاں رہتے ہیں۔

اسلوبی اعتبار سے بھی خودنوشت ایک منفرد مقام و مرتبہ کی حامل ہے۔ گیلانی صاحب بہت ہی دلکش زبان کا استعمال کرتے ہیں۔ انہوں نے جو سادہ اور حسین نثر کا طریقہ اپنایا ہے۔ وہ واقعی قابلِ داد ہے۔ متعدد واقعات کے بیانات اور مختلف اوقات عوامی خطاب کے سلسلے میں قرآن پاک اور حدیث سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ طرزِ بیان اور اسلوب کے لحاظ سے آپ بیتی اپنی مثال آپ ہے۔

مجموعی اعتبار سے خودنوشت ذاتی زندگی اور عوامی زندگی کے دُکھ درد، ظلم و ستم اور جبر و تشدد کی داستان کہی جا سکتی ہے۔ ہندو پاک کے درمیان متعدد جنگوں کا آنکھوں دیکھا حال اور مسئلہ کشمیر کا عالم گیر سطح پر حل نکالنے کی تجاویز وغیرہ کا بہت ہی تفصیلی ذکر ہے۔ الغرض آپ بیتی کو یہاں ذاتی زندگی کے حالات و واقعات کی مکمل ترین عکاسی کا درجہ حاصل ہے وہیں یہ آپ بیتی ایک تاریخی اہمیت کی حامل بھی ہے جس میں کشمیر اور کشمیری عوام کے دل کی دھڑکن محسوس کی جا سکتی ہے۔ اُن کو درپیش آئے واقعات کو حقیقی آئینے میں دیکھنے کا موقع بھی یہ خودنوشت عطا کرتی ہے۔

یادوں کے لمس:۔ ''یادوں کے لمس'' پروفیسر شہاب عنایت ملک کی خودنوشت جنوری ۲۰۱۲ء میں میزان پبلشرز سے شائع ہو کر منظرِ عام پر آئی ہے۔ ۱۰ مارچ ۱۹۶۵ء میں بھدرواہ کے ایک چھوٹے سے گاؤں گاٹھ میں آپ کی ولادت ہوئی۔ یہاں مصنف نے اپنے آبائی وطن کا نقشہ کھینچا ہے جس میں واسکی ناگ کے مندر کی اہمیت، ہر سال نکلنے والی کہلاش یاترا اور اس کے ساتھ عوامی عقیدت مندی بھی سامنے آ جاتی ہے۔

آپ بیتی میں یہاں ذاتی اور نجی زندگی کو موضوع بنایا ہے وہیں کچھ ایسی معزز ہستیوں کا تذکرہ بھی کیا ہے جس سے آپ کو ہمیشہ تحریک ملی ہے۔ ان میں پروفیسر ایتا بھٹو

سابقہ وائس چانسلر جموں یونی ورسٹی، برصغیر کے نامور صحافی وید بھسین اور شیخ عبدالرحمٰن وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

پروفیسر شہاب ملک، قدرت اللہ شہاب سے بھی متاثر نظر آتے ہیں۔ اُنہوں نے خود لکھا ہے کہ میری شخصیت کے اندر جو بے باکی ہے وہ قدرت اللہ شہاب کی بے باک تحریروں کا نتیجہ ہے۔ قدرت اللہ شہاب کے ''یا خُدا'' کے مطالعے کے بعد مصنف ان کے رنگ میں رنگے ہوئے نظر آنے لگتے ہیں وہ خود لکھتے ہیں

''یہ بے باک ناولٹ پڑھ کر میں قدرت اللہ شہاب کا شیدائی بن گیا۔
آج میری شخصیت میں جو بے باکی کا عصر ہے وہ شہاب کی تحریروں کی
وجہ سے ہے''۔ ے

اس خودنوشت میں پروفیسر شہاب ملک نے متعدد عظیم شخصیات اور سیاسی رہنماؤں جن سے اُنہوں نے وقتاً فوقتاً فیض حاصل کیا اور ان کے حوصلہ وعزم کا بھی ذکر کیا ہے۔ ان میں ذوالفقار علی بھٹو، بے نظیر بھٹو، پرویز مشرف، اندرا گاندھی، مولانا آزاد، یاسر عرفات، کرنل قذافی اور صدام حسین وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں جن کے متعلق مصنف نے اپنے تاثر قلم بند کیے ہیں۔

''یادوں کے لمس'' کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ مصنف سیرت نگاری کے فن سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ اس کتاب میں بیشتر شخصیات کا خوبی وخامی کے ساتھ مکمل ترین خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ اُنہوں نے اپنے دادا جی کی شخصیت وسیرت کا ایسا نقشہ کھینچا ہے جس سے اس کوہ وقار ہستی کا دبدبہ، شان وشوکت، اعادات واطوار اور نوابی شوق بھی سامنے آجاتے ہیں جس کی بدولت وہ اپنے علاقہ میں ایک مثالی کردار اور انفرادی حیثیت کے مالک تھے۔

''پورے گاؤں میں دادا جی کا دبدبہ تھا۔ خوش لباس ہونے کے ساتھ

ساتھ وہ پر مذاق شخصیت کے مالک بھی تھے۔ نوابوں کی طرح حقہ
پینا، گھوڑا اور کتا لے کر شکار پر چلے جانا اُن کے پسندیدہ مشاغل تھے
دادا جان کو پورے گاؤں میں ملک دین محمد کے نام سے پکارہ جاتا تھا۔
عمدہ کھانا کھانے کے بہت شوقین تھے۔ گوشت اور مچھلی ان کی پسندیدہ
غذائیں تھیں۔ برف باری کے دوران اپنی بارہ بور کی بندوق لے کر
گھوڑے پر سوار ہو کر اور کتے کو ساتھ لے کر جب وہ بھدرواہ کے
جنگلات میں شکار کرنے کے لئے جاتے تھے تو ایسا لگتا تھا واقعی کوئی
نواب جارہا ہو۔ کبھی کبھی بہت دنوں کے بعد داد جان لوٹتے تھے تو
بہت سارے جنگلی مرغ اور چکور شکار کر کے لے آتے تھے۔'' [۸]

آپ کی شخصیت کا سب سے نمائندہ پہلو بے باکانہ پن ہے۔ ہمت، عزم واستقلال کی بدولت آپ اپنی مثال آپ ہیں۔ خودنوشت میں ایک طرف آپ نے اپنے عزیز واقارب دوستوں اور بزرگوں کے ساتھ اپنے خلوص، محبت، ہمدردی اور عقیدت مندی کو سامنے لایا ہے تو دوسری طرف اُنہوں نے اپنے حاسد اُستاد اور اپنے رشتہ داروں اور اپنے سسرال والوں پر طنز بھی کیا ہے۔ طنز کرتے ہوئے مصنف کو کوئی ہچکی نہیں لگتی چونکہ آپ ایک بے باک انسان ہیں جو دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں وہ ہی صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیتے ہیں۔ اپنے استاد کی شخصیت کے کچھ پہلو آپ نے سامنے لانے کی بھرپور سعی کی ہے۔ شہاب عنایت ملک نے خود لکھا ہے کہ ''میں نے انہیں اپنے والد سے بھی زیادہ عزت دی'' چونکہ ظہور صاحب مصنف کے والد کے ساتھ ہوسٹل کی زندگی گزار چکے تھے اسی مناسبت سے آپ اُنھیں والد کی جگہ رکھ کر عزّت دیتے ہیں۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

''اس بات کا مجھے بعد میں پتہ چلا کہ ڈاکٹر ظہورالدین ہمیشہ ہر معصوم
انسان کی شرافت کا ناجائز فایدہ اُٹھا کر اپنے مفاد کے لئے استعمال

کرتے ہیں اُنھیں دوسروں کا آگے بڑھنا بھی اچھا نہیں لگتا ۔۔۔۔۔۔ میں نے ان (امیتا بھ مٹو) سے وعدہ کیا کہ بہت جلد اپنی کتاب شائع کروں گا۔ خُدا کا شکر یہ ہے کہ میں نے نیا نیا وعدہ بہت جلد اسی سال پورا کیا۔ یہ بات ظہور صاحب کو اچھی نہیں لگی۔ یہ ساری باتیں مجھے ظہور کے شاگرد پہلے ہی بتا چکے تھے۔ لیکن مجھے اس وقت ان باتوں کا یقین نہیں آتا تھا کہ چہرے سے سادہ لگنے والا شخص کسی کو دھوکا دے سکتا ہے ۔۔۔۔۔۔ جب میری کتاب قرۃ العین حیدر بحثییت افسانہ نگار شائع ہوئی۔ اس کے بعد ظہور صاحب مجھ سے خفا رہنے لگے۔ میری سلام کا جواب دینا اُنہوں نے بند کر دیا''۔ ۹

خود نوشت میں جا بجا دلچسپ واقعات بھی قلم بند کئے ہیں۔ جن میں چرار شریف، این۔سی۔پی۔یو NCPU کام کرنے والی لڑکی کا واقعہ، یونی ورسٹی وہوسٹل میں طلبہ کا احتجاج، گلمرگ کے سفر کے دوران دھرم شالہ میں جانا اور گوجر نگر میں رہاش کے دوران اپنے ذاتی نوکر مختار کی چوری وغیرہ کو مصنف نے بڑی فنکارانہ پختگی سے بیان کیا ہے۔

ایک شرارتی اور سیکولر شہاب خود نوشت ''یادوں کے لمس'' سے اُبھر کر سامنے آتا ہیں۔ جن میں بچپن کی شرارتیں، شوق اور جوانی کی اُمنگیں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ کالج کی تعلیم کے دوران سال اوّل میں ہی ایک لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو جانا، اگر چہ محبت یک طرفہ تھی لڑکی نے محبت کا تحفہ قبول نہیں کیا۔ آج تک شہاب صاحب کو اس کا نہایت ہی افسوس ہے اور حیرانگی بھی کہ اس لڑکی نے محبت قبول کیونکر نہیں کی۔ مصنف واقعی بچپن میں بہت شرارتی تھے۔ دادا جی کے صندوق سے نوٹ چوری کرنا، لوگوں کے مرغ چوری کر کے کھانا، باغات میں چوری پھل توڑ کر ہضم کر جانا بھی آپ کی شرارتوں میں شامل ہے۔

''دادا جان کو صندوق میں نوٹ رکھتے ہوئے دیکھ کر میری نیت بدل گئی

جب وہ گھر سے باہر جاتے تھے تو میں اپنا ہاتھ مار لیتا تھا ۔۔۔۔۔جن دنوں میں بھدرواہ کالج میں تھا ہم دوستوں کو مرغ چرا کر کھانے کی عادت پڑ گئی۔ جب بھی ہم کسی کا مرغ چراتے تھے تو باضابطہ طور پر اس کو حلال کر کے اسے عمدہ طریقے سے پکا کر دریائے نیرو کے کنارے اسے ہضم کرتے تھے۔ ہم نے ڈاکٹر عنایت اللہ کے تیتر بھی چرا کر کھائے۔۔۔۔۔اس دور میں گاٹھ میں (آبائی گاؤں) کوئی ایسا باغ نہیں بچا ہو گا جہاں ہم نے چوری کر کے طرح طرح کے سیب و پھل نہ کھائے ہوں گے۔ اس زمانے میں پتنگ بازی کا شوق تھا۔ اس کو میں نے بچپن میں خوب پورا کیا''۔ [10]

اس میں کوئی شک کی گنجائش نہیں کہ پروفیسر شہاب ایک سیکولر کردار اور سیکولر ذہن کے مالک ہیں۔ آبائی گاؤں گاٹھ واسکی ناگ مندر اور وہاں سے نکلنے والی یاترا کے ساتھ ساتھ مسجدوں میں اذان کی گونج کے امتزاج سے ہی ان کے سیکولر ذہن کا خمیر تیار ہو گیا تھا۔ یونیورسٹی کی تعلیم کے دوران سیکولر ذہن رکھنے والی شخصیات جناب وید بھسین ، امیتابھ مٹو، ڈاکٹر مناکشی کیلم ، آنند لہر وغیرہ کی وساطت اور قربت کے فیض سے شہاب عنایت ملک ایک سیکولر شہاب بن جاتے ہیں۔ اس کی ایک زندہ مثال یہ ہے کہ امتیابھ مٹو کے ساتھیوں میں بیٹھے ہوئے مصنف کو کسی قسم کی کوئی کوفت معلوم نہیں ہوتی اور نہ ہی گروجی کے ہاتھ سے ماتھے پر تلک لگانے میں کوئی وحشت ہوتی ہے اور یہاں تک کہ امتیابھ مٹو صاحب نے آپ کو ایک خاص نام دیا ہے۔ جس کو قبول کرنے میں بھی آپ کو کوئی دشواری نہیں ہوئی وہ نام ہے ''شہاب کول''۔

خود نوشت کی سب سے بڑی خوبی سچائی یعنی حقیقت گوئی ہے۔ مصنف نے حقیقت گوئی کا دامن کہیں نہیں چھوڑا۔ حق گوئی اور بے باک پیرائے اظہار ہی کتاب کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ اس روداد حیات میں مصنف نے جس جگہ، علاقے اور جس مقام کا

بھی تذکرہ کیا ہے اس کی ظاہری ساخت ، خوبصورتی اور منظر کشی کو بھی عمدہ طریقہ سے پیش کیا ہے۔ مصنف کا مشاہدہ بھی کمال کا ہے شہاب صاحب نے کشمیر کے سیاسی وسماجی صورتِ حال سے پیدا ہونے والے کرب کو بڑی گہرائی سے محسوس کیا ہے۔ کشمیری لوگوں کو کن حالات میں کشمیر چھوڑ کر ہجرت کرنی پڑی اس المناک حادثے کا بھی آپ نے بڑی دردمندی سے ذکر کیا ہے یہ لوگ کشمیر سے تو محروم ہوئے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اپنی مشترکہ تہذیب ، اپنے کلچر سے بھی محروم ہو گئے ۔ مصنف کی رہائش کا انتظام ڈھل جیل کے ہاوس بوٹ میں تھا۔ یہاں موصوف نے ایک نئے نویلے شادی شدہ جوڑے کو دیکھا جو نسل کے اعتبار سے کشمیری ضرور تھا لیکن اپنے کشمیری کلچر اور تہذیبی وراثت سے محروم تھا کشمیر کے آداب ، رہن سہن اور کلچر سے نا آشنا تھے ۔ اس کی وجہ ان کی ہجرت تھی ۔ جس نے ان کو اپنی وراثت وشناخت سے دور کر دیا۔ شہاب صاحب اس سے بہت متاثر بھی ہوئے اور اُن سے محوِ گفتگو بھی۔

''ایک شام میں اپنے قریبی دوست خورشید احمد کے جھیل ڈل والے ہو س بوٹ میں ٹھہرا ہوا تھا۔ وہاں ایک کشمیری پنڈت لڑکا بھی اپنی دلہن کے ساتھ قیام پذیر تھا۔ شاید یہ جوڑا ۱۹۸۹ء کے بعد کی پیداوار تھا کیونکہ وہ کشمیر کی تاریخ ، تہذیب اور ثقافت سے باہر بے خبر تھے ۔ اُنہوں نے بہت سی چیزوں کی جانکاری مجھ سے لی ۔ کتنا بڑا المیہ ہے جس کشمیر کو ان کے بزرگوں نے اپنے خونِ جگر سے سینچا ان کی اولادیں اپنے اثاثے کو جاننے کے لئے دوسروں کا سہارا لیتے ہیں'' ۔ ۱۲

شہاب ملک نے اپنی زندگی کے اہم واقعات ، احساسات ومحسوسات اور تجربات کے علاوہ اپنے عہد میں رونما ہونے والے سیاسی ، سماجی ، ثقافتی ، اقتصادی اور خاص طور سے جموں وکشمیر کی سیاسی صورتِ حال اور بالخصوص کشمیری قوم کو ہجرت کے سبب بے شمار مصیبتوں ، دکھوں اور پریشانیوں کے ساتھ ساتھ کئی خاندانوں کو اپنی وراثت اور کلچر سے بھی دور ہونا پڑا

وغیرہ کا بڑے ہی انہماک اور دردناک طریقے سے پیش کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تخلیق اظہار ذات تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ مصنف اپنے گردونواح اور جگ بیتی کی بھی خبر رکھتے ہیں۔

اُردو انشائیہ:۔ کشمیر میں شاعری، ڈراما، تحقیق وتنقید، صحافت اور فکشن کے حوالے سے اردو کی خدمت کرنے والوں کی کمی نہیں لیکن اردو انشائیہ کے میدان میں کم ہی حضرات ایسے ہیں جنھوں نے اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں اس صنف کو تقویت بخشنے میں نہایت فراخ دلی سے کام لیا ہے، ان میں محمد زمان آزردہ، محمد شفیع اور ڈاکٹر منصور احمد منصور کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس سے قبل گزشتہ دہائیوں میں شمیم احمد شمیم، سوم ناتھ زتشی، غ۔م۔ طاؤس اور ستار شاہد وغیرہ نے بھی اُردو انشائیہ نگاری کے جوہر دکھائے ہیں۔

پروفیسر محمد زمان آزردہ:۔ کی انشائیہ نگاری جس تنقیدی قدر شناسی کی مستحق ہے، اس کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ پھر بھی محمد زماں آزردہ نہ صرف اپنی انشائیہ نگاری کا لوہا منوانے میں کامیاب ہوئے ہیں بلکہ ان کے انشائیے اپنی انفرادیت، تازگی اور شادابی احساس دلاتے رہے۔

پروفیسر آزردہ کشمیری اور اُردو دونوں زبانوں میں لکھتے ہیں۔ ان کے انشائیوں کے ۹ مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان کا پہلا مجموعہ ''غبارِ خیال'' کے عنوان سے ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا اور پھر یکے بعد دیگر آٹھ مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور آج اکیسویں صدی میں بھی اس صنف کی آبیاری پوری آب وتاب کے ساتھ کر رہے ہیں۔

آزردہ صاحب کے تین کشمیری انشائیے ''فکر ہنر ٹکر''، ''ننہ پوش'' اور ''ابسے'' منظر عام پر آئے ہیں۔ اور ''ابسے'' پر انہیں ساہتیہ اکادمی انعام بھی ملا ہے۔ اُردو میں ''غبارِ خیال'' کے بعد ''شیرین کے خطوط''، ''غبارِ کارواں''، ''کانٹے''، ''گلدستہ'' اور ''سن تو سہی'' شائع ہوئے۔ ''کانٹے'' ان کے کشمیری انشائیوں کا اُردو ترجمہ ہے۔ غبار کارواں اور سن تو سہی کو کلچرل

اکادمی اور یوپی اُردو اکادمی نے انعامات سے نوازا ہے۔''غبارِ خیال'' کے پیش لفظ میں پروفیسر شکیل الرحمٰن ان کے انشائیوں کے بارے لکھتے ہیں۔

''غبارِ خیال کے انشائیوں میں جو تاثرات ہیں اور جذبوں کے آہنگ کا جس طرح اظہار ہوا ہے ان سے زماں صاحب کے داخلی ہیجان اور ذہن کی لہروں پر تیز دوڑتی ہوئی چنگاریوں کی بے تابی، ان کی منتشر کیفیتوں اور لفظوں کی صورتوں میں ان کی ''آزادی'' کو سمجھا جا سکتا ہے۔ داخلی ہیجان بے تاب چنگاریوں کا انتشار اور ان کی آزادی......اس آرٹ کی بنیادی خصوصیات ہیں۔ محمد زماں کے انشائیوں کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ بنیادی خصوصیات سے واقف ہیں۔ ان کی سوچ، محنت اور ریاضت سے یہ آرٹ ان کا اپنا آرٹ بن سکتا ہے''۔ [۱۴۳]

پروفیسر آزردہ صاحب نے اس صنف کو با قاعدگی سے اپنا کر ایک منجھے ہوئے انشائیہ نگار کی طرح فن کی باریکیوں، نزاکتوں اور گہرائیوں کو گرفت میں لیا ہے۔ ان کے آرٹ کا بنیادی وصف چراغ کو سورج دکھانا ہے۔ وہ اندھیرے میں ایک چراغ روشن کرتے ہیں اور تاثرات، کیفیات اور احساسات کی آمیزش سے اس کی لو بڑھاتے ہیں۔ چراغ کی لو کی تھرتھراہٹ سے مختلف اشیا اور متضاد کیفیات واضح تر ہونے لگتی ہیں کہ انشائیہ نگار چراغ کے آگے اچانک سورج لا کر رکھ دیتے ہیں۔ سورج کی تیز روشنی سے چراغ کی لو سے ابھرنے والی کیفیات و تاثرات کے سائے معدوم ہو جاتے ہیں سورج کی تپش شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ یہ سورج انسان کی فطری ناہمواریوں اور تلخ حقیقتوں کا اجالا پھیلا دیتا ہے تو چراغ کے ماتھے سے عرق الفعال کے قطرے ٹپک ٹپک کر اسے بجھا دیتے ہیں۔ قاری اپنی فطرت، سرشت، مزاج اور حقیقت کے متضاد رخ دیکھ کر تلملاتا ہے۔

''بیل'' آرزدہ صاحب کا ایک اہم انشائیہ ہے۔ ''بیل'' ہم سب کا دیکھا بھالا جا

نور ہے لیکن جب انشائیہ نگار ہماری توجہ شہر کے مصروف ترین چوراہے پر پالتی مار کر بیٹھے ہوئے بیل کی طرف مبذول کرتے ہیں تو ہم اس میں نہ صرف دلچسپی لینے لگتے ہیں بلکہ اس انشائیہ سے ان کی انشائیہ نگاری کے کئی رُخ اور پہلو بھی سامنے آتے ہیں۔ انشائیہ ''بیل'' سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

''میری اس گفتگو کے ہیرو کا شہر کے مصرف ترین چوارا ہے پر پالتی مار کے بیٹھا حیران کن ہے۔ لگتا ہے غالب کی طرح یہ آج بھی دنیا کو بازیچۂ اطفال سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ جلوت میں خلوت کے اس عالم کا تقاضہ آپ پہنچے ہوئے بزرگوں سے ہی کر سکتے ہیں۔'' ۱۴

اس اقتباس میں جو نکتہ آفرینی ملتی ہے وہ سوچ اور تاثرات کی لہروں پر دائرہ در دائرہ پھیلتی، بڑھتی اور بکھرتی جاتی ہے لیکن اس بکھراؤ اور انتشار کے پس پردہ تنظیم کا جو مربوط نقشہ اُبھرتا ہے وہ ہماری سماجی مجلسی، تہذیبی اور سیاسی زندگی کے کتنے ہی پہلوؤں کو آئینہ بنا دیتا ہے۔

زماںؔ آرزدہ اپنے انشائیوں میں چھوٹے چھوٹے فقروں سے بھی فلسفیانہ انداز بیان کے ذریعے معنی کی ایک نئی دنیا آباد کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے اسلوب میں تازگی اور لطافت کا احساس بڑھ جاتا ہے، چند مثالیں دیکھیے۔

زندگی یا تو رسوائیوں کا مجموعہ ہے یا بجائے خود ایک رسوائی''۔ ۱۵

''فطرت کا قانون عجیب ہے۔ ہر پھول کے ساتھ کانٹا ہے۔ زندگی کے ساتھ موت ہے۔ دھوپ کے ساتھ سایہ''۔ ۱۶

''وقت ایک آئینہ ہے جس میں جلد یا بدیر ہر آدمی اپنا چہرہ دیکھ لیتا ہے''۔ ۱۷

زماںؔ آرزدہ کے انشائیوں میں اس طرح کی بے شمار مثالیں مل جاتی ہیں جہاں وہ فلسفیانہ فکر کے ذریعے زندگی اور کائنات کے بارے میں ایک نئے زاویے سے دیکھنے اور

سوچنے پر مجبور کرتے ہیں لیکن ان کا انداز اتنا دلکش اور دلچسپ ہوتا ہے کہ ہم ان کی باتوں کو بڑی آسانی سے قبول کرتے جاتے ہیں۔

مجموعی طور پر زماں آزردہ کے انشائیوں کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ خوش گواری میں جب اپنے تجربات و مشاہدات کی روشنی میں اپنے خیالات کو نئے اور انوکھے انداز میں پیش کرتے ہیں تو نہ صرف ان کی فلسفیانہ سوچ اور خوش طبعی کے جوہر ہم پر عیاں ہوتے ہیں۔ بلکہ وہ اپنے قاری کو افراد اشیا اور واقعات کو ایک نئے تناظر میں دکھا کر ایک لطیف و انبساطی کیفیت اور نئے و تازہ احساس سے دوچار کرتے ہیں اور غور و فکر کا ایک نیا زاویہ بھی عطا کرتے ہیں۔ان کے انشائیوں کی اسی خصوصیت کے پیش نظر کے۔ کے نیر نے زماں آزردہ کے انشائیوں کی جو تعریف کی ہے وہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

''ہمارے ملک میں انشائیہ کے شیدائیوں کی تعداد زیادہ نہیں، زیادہ کیا اتنی بھی نہیں جتنی پاکستان میں ہے۔ زماں آزاردہ کا قلم غنیمت ہے، جو انشائیے کی جوت جگائے ہوئے ہیں۔ ان کے موضوعات بے حد دلچسپ ہیں وہ زندگی اور اس کے مظاہر اور اشیا کو نئے زاویے سے دیکھنے کے عادی ہیں اور وہ اپنے انوکھے تجربوں میں اپنے پڑھنے والوں کو بھی برابر شریک رکھتے ہیں وہ بے حد حساس ہیں اور اسی لیے جب بھی ان کے لطیف احساسات خارجی ماحول سے متصادم ہوتے ہیں تو ان کے قلم میں شدید قسم کی جنبش اور ارتعاش جاگ اُٹھتا ہے۔ مجھے تو ان کے انشائیوں کو پڑھتے ہوئے ہمیشہ ہی زندگی اور فرحت کا احساس ہوا ہے کہ وہ انشائیے میں ڈوب کر جی لگا کے لکھنے کے عادی ہیں اور یہی وہ رویہ ہے جسے فیضؔ نے خونِ دل میں انگلیاں ڈبونے کا نام دیا ہے''۔ [۱۸]

الغرض کہ زماں آزردہ آج بھی متواتر انشایئے لکھ رہے ہیں۔ان کے یہاں مو ضوعات کی رنگا رنگی بھی اور تازگی بھی۔ اُنہوں نے جانوروں پر بھی انشایئے لکھے اور انسانوں پر بھی، موسم شہر اور انسانی رشتے بھی ان کے انشائیوں کا موضوع بنتے رہتے ہیں۔

منصور احمد منصور:۔زود نویس نہیں ہیں آپ کم لکھتے ہیں لیکن جو کچھ بھی لکھتے ہیں ایک معیار اور وقار کے ساتھ لکھتے ہیں۔ منصور احمد منصور کی تصنیف ''کشمیر خواب، سراب، گرداب'' ۲۰۰۶ء میں شائع ہو کر ادبی حلقوں میں خوب داد تحسین وصول کر چکی ہے۔ دراصل یہ تصنیف منصور احمد منصور کے ایسے انشائیوں کا مجموعہ ہے جن کا مرکزی محور کشمیر ہے کشمیر کی پانچ ہزار سالہ تاریخ میں ظلم و جبر کے لامتناہی سسکوں نے کشمیر کی زمین اور ریاست کی عوام کے ضمیر پر جو زخم لگائے ہیں ان سب کو منصور احمد منصور نے اپنے انشائیوں میں کمال مہارت کے ساتھ اپنے وجود میں سمیٹا ہے اور ادبی انداز میں ان کا اظہار کیا ہے۔ ''کشمیر خواب، سراب، گرداب'' کے مضامین میں کشمیر کے حالات اہل کشمیر کی نفسیات اور عروج و زوال کے اسباب کے حوالے سے بھر پور طنز کے تیر بھی ہیں اور مزاح کے شگوفے بھی دانشورانہ تبصرے بھی ہیں اور فقیرانہ بے نیازی بھی اس بات کا اندازہ ان کے درج ذیل اقتباسات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

> ''ہماری کہانی بالکل مختلف ہے نہ اس کی کوئی ابتدا ہے نہ وسط اور نہ ہی کوئی انتہا یہ کہانی نہ تو کلائمکس کو پہنچتی ہے اور نہ کسی انجام کو اس کہانی کا کوئی عنوان بھی نہیں کوئی مرکزی کردار بھی نہیں اس کے بہت سے کردار ہیں اس میں سارا معاشرہ ایک کردار کی طرح ہے لیکن نہ کسی کے منہ میں زبان ہے نہ کوئی بولتا ہے تو وہ اپنے مافی الضمیر کا اظہار نہیں کرتا کیونکہ فطرت نے ہمیں ضمیر سے معاف رکھا اس کے یہاں زبان پر جو بات آتی ہے وہ دل میں نہیں ہوتی اور جو بات دل میں ہوتی ہے وہ زبان پر نہیں آتی۔ ۱۹

ایک اور اقتباس پیشِ خدمت ہے جس میں انہوں نے کشمیر کو عجائب خانے سے تعبیر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''بھائیو! رب کا شکر ادا کرو بہار آئے نہ آئے گل اب بھی کھلتے ہیں اور روز نئے گل کھلائے جاتے ہیں یہ گل باغوں میں نہیں بلکہ ڈرائنگ روموں اقتدار کے ایوانوں اور محل خانوں میں کھلائے جاتے ہیں ویسے بھی گل کھلانا عجائب خانہ کی پرانی ریت ہے یہاں کی مریادا ہم نے کب گل نہیں کھلائے۔ ہم اس وقت بھی گل کھلائے جب مسلم کانفرنس کے ماتھے پر نیشنل کانفرنس کا قشقہ لگایا اور مسجد سے نمک کو دیر میں آس جمائے۔ ہم نے اس وقت بھی گُل کھلائے جب ''محاذ رائے شماری'' کو حرف غلط کی طرح اس کی جگہ زعفرانی اور کیسری رنگ سے ''آوارگی'' لکھ دیا''۔ ۲۰

منصور احمد منصور نے اپنی تحریروں میں جموں وکشمیر کو ایک عجائب خانہ سے تعبیر کیا ہے۔ ریاست عوام کی امیدوں، خواہشوں اور خوابوں کی لغزشوں کا عجائب خانہ، اس ریاست کی تاریخ کے ہر ورق پر ایسے خواب نظر آئیں گے جو کبھی پورے نہیں ہوئے۔ منصور احمد منصور کا یہ کہنا بجا ہے کہ۔

''ہم نے رائے شماری کا خواب دیکھا سرینگر راولپنڈی روڈ کھلنے کا خواب آزادی اور عزت و آبرو کا مقام پانے کا خواب دیکھا لیکن نتیجہ ہمیشہ ہمارے خوابوں کے برعکس ہی سامنے آیا۔ اور اپنی نا تمام اور نا آسودہ آرزوئیں ہمیں تڑپانے لگیں''۔ ۲۱

منصور احمد منصور نے جموں وکشمیر کی عوام کی سادہ لوحی کی بنیاد پر ریاست کو ایک عجائب خانہ قرار دیا ہے اگر دیکھا جائے تو منصور احمد نے طنزیہ ومزاحیہ انداز میں کشمیریوں کو

جھنجھوڑا ہے اور بیدار کرنے کی ایک بہترین کوشش کی ہے منصور احمد کے انشائیوں کو پڑھ کر ہنسی تو آتی ہے لیکن جب الفاظ اور جملوں میں چھپے ہوئے طنز کا اثر پڑھنے والے کے وجود میں آہستہ آہستہ اُترتا ہے، پھیلتا ہے تو ہنسی شرمندگی اور پچھتاوے میں بدل جاتی ہے اور یہ انشائیہ نگاری کی خصوصیات میں سے ایک ہے۔

منصور احمد منصور میں بے پناہ صلاحتیں ہیں ان انشائیوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ نہ صرف ان کا مشاہدہ بہت گہرا ہے بلکہ زبان و بیان پر بھی قابل قدر قدرت حاصل ہے۔ عام طور پر سادہ اور سہل اسلوب اختیار کرتے ہیں لیکن موقع و محل کے اعتبار سے حسن بیان کا مظاہرہ بھی بڑی خوبی کے ساتھ کرتے ہیں مثلاً۔

> ''تو صاحبو سب جل کر راکھ ہوا۔ سروچمن یا قرار خاطر، جسم و جاں ہو یا عزت و ناموس مکان ہو یا مکین...... سرخ جوڑے میں ملبوس آزادی کی دلہن اپنے ہاتھوں میں خون کی مہندی رچائی ہے...... یہ اسی کے ہاتھ آتی ہے جو مرد آزما اور مرد آفریں ہو اور جس کے ہاتھ میں طاوس و رباب نہیں بلکہ شمشیر و سناں ہو، جو نعم و ناز میں پلا ہوا بریشم نہ ہو بلکہ فولاد سے بھی سخت ہو''۔۲۲

منصور احمد منصور کے انشائیہ ''نہ جنوں رہا نہ پری رہی'' میں مزاح کی چاشنی کے ساتھ طنز کی جو کاٹ ملتی ہے وہ کشمیر کے عصری حالات اور اہل کشمیر کی بے بسی بلکہ بے حسی کے حوالے سے قاری کے دل کی گہرائیوں تک اُتر جاتی ہے۔ مثلاً

> ''اساتذہ کی زمین شعرا گلے نہ اگلے اپنی زمین تو صدیوں سے خون اگلتی ہے اسے ہر دور میں بہادران وطن نے خون سے سینچا ہے۔ اگر کبھی خدانخواستہ خشک سالی کی وجہ سے زمین خون اگلنا بند کر دیتی ہے تو لیڈر حضرات فوراً ترنگ میں آکر نعرہ مستانہ بلند کرتے ہیں کہ ''اس زمین کو

خون سے سینچو' چنانچہ جو لوگ اپنی جھونپڑیوں کے ننگے فرش پر خون تھوک رہے ہوتے ہیں وہ نعرہ مستانہ سن کر دیوانہ وار جھونپڑیوں سے نکل کر سڑکوں پر آتے ہیں اور خون تھوکتے ہیں یوں زمین پھر سے لالہ زار بن جاتی ہے۔ ۲۳؎

منصور احمد نے گذشتہ کئی دہائیوں سے ''کشمیر'' کے نام پر ہونے والی بھانت کی سیاست اور تجارت کی بازیگری اور شعبدہ بازی کا صرف مشاہدہ نہیں کیا ہے بلکہ ان کے اندر رہ کر ذاتی طور پر تجربہ بھی کیا ہے اور یہ محسوس کیا ہے کہ کس طرح کشمیر خاک وخون اور وخواب سراب کے محیر العقول حالات سے گزر کر ایک عجائب خانہ میں تبدیل ہو چکا ہے۔ کشمیر کو عجائب خانہ سے تعبیر کرنا مصنف کی کشمیر کے ساتھ عقلی اور منطقی ہی نہیں شدید جذباتی اور قلبی وابستگی کی بھی مثال ہے۔ اس باب میں منصور احمد خود سے باہر ہو جاتے ہیں اور انتہا پسندی ان پر غالب نظر آتی ہے۔ بعد غور وفکر کے یہ اطمینان ہوتا ہے کہ جو قوم صدیوں سے مختلف النوع مسائل اور محرومیوں کا شکار رہی ہو اور عذابوں کے ختم نہ ہونے والے پلِ صراط پر چلتے رہنا جس کا مقدر بن چکا ہو۔ اس قوم کے دانشوروں میں بھی اگر بے خوف انتہا پسندی پیدا ہو تو اسے غیر فطری نہیں کہیں گے۔

سفر نامہ:۔ جموں وکشمیر کے تعلق سے اگر سفر نامہ کا جائزہ لیا جائے تو اس میدان میں بھی انشائیہ نگاری کی طرح ابتدا سے بہت کم لوگوں ملتے ہیں۔ سفر نامہ کے ابتدائی نقوش پنڈت سالک رام کے یہاں ملتے ہیں اور ریاست کا پہلا سفر نامہ سالکؔ کا ''تحفۂ سالک'' تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد کئی سفر نامے لکھے گئے جن میں ''میری پاکستان یاترا'' (ملک راج صراف) ''پاکستان میں دو دن'' (اوم پرکاش) ''مجموعہ آئینہ'' (حامدی کاشمیری) ''کولمبس کے دیس میں، پشکن کے دیش میں (جگن ناتھ آزاد) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ لیکن اکیسویں صدی کے پہلے عشرے میں ریاست جموں کشمیر میں اُردو سفر نامے کو فروغ دینے والوں میں پروفیسر

شہاب عنایت ملک، خواجہ ثنا اللہ بٹ اور صوفی غلام محمد کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔

پروفیسر شہاب عنایت ملک کے سفر ناموں میں ''میری لکھنؤ یاترا'' (۲۰۱۱ء)، ''مندروں کے شہر سے گوتم بدھ کی سرزمین تک'' (۲۰۱۲ء)، ''یاور عباس کے ساتھ پانچ دن'' (۲۰۱۳) اور ''سولن میں چار دن'' (۲۰۱۳) قابل ذکر ہیں۔

ان میں سے پروفیسر موصوف کے بیشتر سفر نامے اُن کی تازہ ترین تصنیف ''عصری ادبی تفکرات'' میں شامل ہیں جو ۲۰۱۳ء میں منظر عام پر آئی۔ ان سفر ناموں کے مطالعے سے لکھنؤ، سولن، دربھنگہ اور جموں وکشمیر کے سیاسی، سماجی، ثقافتی، علمی، ادبی، تہذیبی اور جغرافیائی حالات وواقعات سے آگہی ہوتی ہے۔ شہاب عنایت ملک کے سفر ناموں پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر شہناز قادری لکھتی ہیں۔

> ''پروفیسر شہاب عنایت ملک اپنے وسیع مطالعے اور گہرے مشاہدے کی بنا پر اپنے سفر ناموں میں مختلف مقامات کی مکمل تصویر کشی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ پروفیسر موصوف نے دوران سفران تمام جگہوں کی ہمہ پہلو تاریخی، ثقافتی وجغرافیائی حالات کا پتہ لگا کر قارئین کے لیے معلومات کا ایک بیش بہار سرمایہ سپرد قلم کیا ہے جس کی وجہ سے یہ سفر نامے ہر اعتبار سے بیش بہا معلومات کا منبع وسرچشمہ قرار دیے جا سکتے ہیں۔'' [۲۴]

مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ پروفیسر شہاب عنایت ملک کے سفر نامے ریاست جموں وکشمیر کے اکیسویں صدی کے غیر افسانوی ادب میں کافی اہمیت رکھتے ہیں۔ وہ سفر نامہ کے فن پر پوری قدرت رکھتے ہیں اور یہ اپنی نوعیت کے نہایت ہی منفرد اور متنوع سفر نامے ہیں۔

روزنامہ آفتاب کے مدیر خواجہ ثنا اللہ بٹ کشمیر کے ایک کہنہ مشق صحافی، ادیب اور دانشور ہیں۔ اُن کا ''سفر نامہ پاکستان'' اپنے ہی اخبار ''آفتاب'' میں قسط وار شائع ہوتا رہا۔ یہ

سفرنامہ بزم دوستاں کا رنگ لئے ہوئے ہے۔اس میں بٹ صاحب نے کئی مصلحتوں کے پسِ نظر پاکستان میں صرف اپنے حلقہ احباب سے ملاقاتوں اور مجلس آرائیوں کا ہی ذکر کیا ہے۔

''وادی کی آواز'' کے مدیر غلام نبی شیدا نے بھی چند برس قبل پاکستان کا دورہ کیا ہے۔اُنہوں نے بھی اپنے سفر کی روداد اخبار میں بیسیوں قسطوں میں شائع کی۔شیدا کی خاص بات یہ ہے کہ وہ نتائج سے بے پرواہ ہو کر دل کی بات نوکِ قلم پر لاتے ہیں۔''سفرنامہ پاکستان'' بھی ان کے مزاج کے اسی پہلو کو سامنے لاتا ہے۔

اکیسوی صدی کے آغاز میں ہی موتی لال ساقی کا ایک چھوٹا سا قزاخستان کا سفرنامہ چھپا تھا۔ساقیؔ پہلی بار وسط ایشیا کے سفر پر گئے۔اس لئے اُنہیں سوویت دورِ حکومت کے وسطی ایشیا کے بارے میں ذاتی اور عملی علم نہ تھا۔اب جب کہ قزاخستان باقی وسطی ریاستوں کی طرف ایک آزاد ملک ہے، وہ بھی اُن بے شمار مسائل سے دوچار ہے جن سے سوویت حکومت کے ٹوٹ جانے کے بعد پورا سابقہ سوویت یونین دوچار ہوا۔غرض کہ قزاخستان قدرتی وسائل سے سرشار ہے اس لئے وہاں باقی ریاستوں کی نسبت تعمیری اور ترقیات کے کام بڑے شدومد سے شروع کیے گئے ہیں۔ساقیؔ صاحب کا سفرنامہ اس وقت تک بھی قزاخستان پر کسی ریاستی باشندے کا تازہ ترین سفرنامہ شمار ہو سکتا ہے۔

آخر الذکر جموں وکشمیر میں اکیسویں صدی کے غیر افسانوی ادب کا جائزہ لینے کے بعد اس بات کا انداز ہوتا ہے کہ ریاست میں یہ صنف اپنی کم سنی کے باوجود ہیئتی، موضوعات اور تکنیکی سطح پر اعلیٰ روایات قائم کر چکی ہے۔موجودہ دور میں ریاستی سطح پر جو غیر افسانوی ادب تخلیق ہو رہا ہے وہ بین الاقوامی انشائیوں اور سفرناموں کے مقابلے رکھا جا سکتا ہے۔

حواشی

۱۔ ڈی ڈی ٹھاکور، یادوں کے چراغ، گلشن پبلی کیشنز، سرینگر ۲۰۰۶ء، ص ۲۳۔

۲۔ ڈی ڈی ٹھاکور، یادوں کے چراغ، گلشن پبلی کیشنز، سرینگر ۲۰۰۶ء ص ۴۵۔

۳۔ ڈی ڈی ٹھاکور، یادوں کے چراغ، گلشن پبلی کیشنز، سرینگر ۲۰۰۶ء ص ۶۹۔

۴۔ آغا اشرف، کچھ تو لکھیے کہ لوگ کہتے ہیں، شالیمار آرٹ پریس سرینگر، ۲۰۰۹ء ص ۴۴۔

۵۔ آغا اشرف، کچھ تو لکھیے کہ لوگ کہتے ہیں، شالیمار آرٹ پریس سرینگر، ۲۰۰۹ء ص ۲۰۱

۶۔ سید علی شاہ گیلانی، وُلر کنارے، مرکزی مکتبہ تحریکِ حُریت حیدر آباد، سرینگر ۲۰۱۰ء، ص ۱۵۵

۷۔ پروفیسر شہاب عنایت ملک، یادوں کے لمس، میزان پبلشرز، سرینگر ۲۰۱۲ء ص۔ ۱۰۸

۸۔ ایضاً ------------------------ ص ۹۶

۹۔ ایضاً ------------------------ ص ۵۰

۱۰۔ ایضاً ------------------------ ص ۲۸، ۱۲۷

۱۱۔ ایضاً ------------------------ ص ۹۵

۱۲۔ ایضاً ------------------------ ص ۳۳

۱۳۔ شکیل الرحمان اعظمی پروفیسر، بحوالہ، غبار خیال، میزان پبلشرز، سرینگر ۱۹۷۳ء ص ۶۰

۱۴۔ زماں آزردہ پروفیسر، بیل، ص ۳۷۔

۱۵۔ زماں آزردہ پروفیسر، پیشے کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے، غبارِ کارواں، ص ۵۱۔

۱۶۔ زماں آزردہ پروفیسر، حضرات مدیر، غبارِ کارواں، ص ۴۷۔

۱۷۔ زماں آزردہ پروفیسر، شادی کو سودا سمجھنے والوں کے نام، سن تو سہی، ص ۸۶۔

۱۸۔ کے کے نیر، تاثرات، مشمولہ غبار کارواں، ص ۲۰۶۔

۱۹۔ ڈاکٹر منصور احمد منصور، کشمیر: خواب، سراب اور گرداب، میزان پبلشرز، سرینگر صفحہ ۳۴

۲۰۔ ڈاکٹر منصور احمد منصور، کشمیر: خواب، سراب اور گرداب، میزان پبلشرز، سرینگر، مضمون، کیسے کیسے گل کھلاتے ہیں لوگ ۸۹

۲۱۔ ڈاکٹر منصور احمد منصور، کشمیر: خواب، سراب اور گرداب۔ میزان پبلشرز، سرینگر، مضمون، خواب خاک اور خون ص، ۴۹۔

۲۲۔ ڈاکٹر منصور احمد منصور، تحریر نہ جنوں رہا نہ پری، ص ۴۳۔

۲۳۔ منصور احمد منصور، تحریر نہ جنوں رہا نہ پری، ص ۲۷۔

۲۴۔ ڈاکٹر شہناز قادری، اُردو کے چند مشاہیر، ادبستان پبلی کیشنز، دہلی، ۲۰۱۳ء۔

جموں وکشمیر میں اُردو شاعری

(۲۰۰۰ء تا ۲۰۱۳ء)

جموں وکشمیر میں اُردو شاعری ایک طویل موضوع ہے جس کے ساتھ انصاف ایک مکمل کتاب کا متقاضی ہے۔ جموں وکشمیر میں اردو شاعری کے آثار باضابطہ طور پر اس وقت سے مل رہے ہیں جب سے شمالی ہند میں اُردو شاعری کے آثار ملتے ہیں۔ بقول حافظ محمود شیرانی ''دلی میں ابھی اردو دبستان قائم ہی نہیں ہوا تھا کی یہاں کے لوگوں نے اردو مثنویاں لکھنی شروع کردی تھیں''۔ جموں وکشمیر میں اردو شاعری کی ابتداء اور ارتقاء کے تاریخی پسِ منظر کو یہاں بیان کرنا ناانصافی کے مترادف ہوگا۔ کیونکہ میرا موضوع یہ اجازت نہیں دیتا کہ میں اس شعری تاریخ کے پس منظر کو تفصیلاً صفحہ قرطاس پر بیان کرسکوں۔ لیکن یہاں اس بات کا ذکر بھی بے جا نہیں ہوگا کہ ریاست میں شاعری کو جلوت بخشنے والوں میں مقامی شعراء کے بجائے غیر مقامی سخنوروں کا بھی اہم رول رہا ہے۔ ''بہار گلشن کشمیر'' میں ۱۸۸۰ء سے پہلے دو ہندو شاعروں کا تذکرہ ملتا ہے۔ جن کے نام پنڈت شیونارائن بھان عاجز اور دیناناتھ چکن مست کشمیری ہیں۔ مست کشمیری کی نظم ''کسی کے گیسو'' ایک خوبصورت نظم ہے جو شاعر کی افتادطبع اور زبان وبیان پر گرفت کا پتہ دیتی ہے۔

یہ شک ریز گیسو
یہ عطر بیز گیسو
ابرِ بہار گیسو

کالے ہیں یہ بلا کے
پھندے ہیں یہ قضا کے
مارِ خموش گیسو

مجنوں کی ان سے دہشت
لیلیٰ کی ان میں رنگت
ہیں عشق زار گیسو۔ ۱

جن شعراء نے جموں وکشمیر کی ادبی فضاؤں کو فروغ دیا اور ان کی جڑوں کو اپنے خون جگر سے سینچا ان میں اول سہرا امیر کمال الدین حسین اندرابی رسوؔا کے سر جاتا ہے۔ بقول پروفیسر عبدالقادر سروریؔ۔

''رسوا دہلی میں رہتے تھے جہاں ان کے فن کی قدر ہوئی اور شہزادا کبر شاہ کی سرکار میں وہ ملازم رہے لیکن معظم نے اکبر شاہ کو شکست دی تو وہ کشمیر لوٹ آئے اور یہاں اپنے فن کی خدمت اور نوجوانوں کی اس فن میں تربیت کرتے ہوئے زندگی گزار دی چنانچہ اس فن سے ان کے بہت سے تلامذہ ہوئے۔ ایک شاگرد مچھی رام نے ان کے رقعات کو ان کے فارسی اور اردو کلام کے ساتھ ایک مجموعے کی صورت میں اکٹھا کر کے ''رقعات خاتم الکمال'' کے نام سے موسوم کیا ہے اس کے مخطوطے محکمہ تحقیقات سری نگر کے کتب خانے میں موجود ہیں''۔ ۲

رسوؔا کا یہ دور سترھویں اور آٹھارویں عیسوی صدی کا دور تھا۔ چنانچہ انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی میں ریاست میں علمی و ادبی سرگرمیوں کا باقاعدہ آغاز ہوگیا تھا اور اُردو سرکاری زبان کا درجہ اختیار کر چکی تھی۔ ایک ادبی انجمن ''بزم سخن'' کا قیام بھی عمل میں آچکا تھا۔ اس انجمن کے بانیوں میں غلام حیدر چشتی، قاضی شمس الدین، مرزا مبارک بیگ اور

عبدالحکیم شامل تھے۔ اس انجمن نے پہلی مرتبہ جموں میں طرحی مشاعروں کی بنیاد رکھی اور اس کے بعد باقاعدہ مشاعرں کا اہتمام ہونے لگا۔ ان مشاعروں میں ممتاز شعراء رچھپال سنگھ، خوشی محمد ناظر، کیفی دہلوی، سیماب اکبرآبادی، ساغر نظامی، یاس یگانہ چنگیزی، حفیظ جالندھری، روش صدیقی، جگر مرادآبادی، اختر شیرانی، موہن لال ساحر، میر عابد علی عابد، عندلیب شادابی، سید عبدالحمید عدم، صوفی تبسم، احسان دانس اور فیض احمد فیض وغیرہ شرکت کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ریاست میں سب سے پہلا مشاعرہ ۱۹۶۴ء میں رچھپال سنگھ شیدا کی صدارت میں ہوا اور نظامت کے فرائض کیفی دہلوی نے سرانجام دیئے۔ اس انجمن کی دیکھا دیکھی میں ایک اور ادبی انجمن ''بزم مشاعرہ'' کے نام سے قائم ہوئی۔ ریاست میں ایسی ادبی تنظیموں کے قیام اور ہندوستان کے نامور شعراء کی مشاعروں میں شرکت نے ریاست میں ایک خاص علمی و ادبی ذوق کو جنم دیا۔ اس دور کے شعراء میں زینت بی بی محجوب اپنے شعری مجموعہ ''گلبن نعت'' ۱۸۷۷ء کی وجہ سے اُنچا مقام رکھتی ہیں۔ پیرزادہ محمد حسین عارفؔ، منشی امیرالدین امیرؔ، ہرگوپال خستہؔ، سالگ رام سالک، مرزا سعد الدین سعد، نندلعل کول طالبؔ، محمد الدین فوقؔ، طالب کاشمیری، کشپ بندھو، رسا جاویدانی، عبدالاحد آزاد، پریم ناتھ بزاز، ملک راج صراف، پریم ناتھ پردیسی، میر غلام رسول نازکی، شہ زور کاشمیری، قیصر قلندر، حبیب کیفوی، کشمیری لال ذاکر، تیج بہادر بھان، حامدی کاشمیری، عابد مناوری، حکیم منظور اور مظفر ایرج وغیرہ نے اس ادبی گلشن کی آبیاری میں کوئی دقیقہ فراگذاشت نہیں کیا۔ اس طرح چراغ سے چراغ جلتے رہے اور آج ریاست کے تینوں حصّوں میں اردو کے کم وبیش سینکڑوں شاعر کمال فن کا مظاہرہ کررہے ہیں۔ دراصل میں نے اپنے موضوع کے مطالعے کو ان ہی شعرا تک محدود رکھا ہے۔

اکیسویں صدی کی پہلی دہائی کے شعری ادب کے حوالے سے اگر بات کی جائے تو ریاستی شعراء کے شعری مجموعے آئے دن وقتاً فوقتاً منظرِ عام پر آتے رہے ہیں۔ جن میں سے بعض کو نہ صرف ریاستی سطح پر سراہا گیا ہے بلکہ عالمی سطح پر بھی انہیں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا

جارہا ہے۔ جموں وکشمیر کے موجودہ دور کے وہ شعراء جنھوں نے اپنے اسلوبِ بیان، منفرد حسیت، جمالیاتی ذوق اور متنوع موضوعات سے اُردو شاعری کو ہم کنار کیا ان شعرا میں حامدی کاشمیری، پرتپال سنگھ بیتاب، ودیا رتن عاصی، مظفر ایرج، محمد زماں آزردہ، رفیق راز، ہمدم کاشمیری، خالد بشیر احمد، ایاز رسول نازکی، اقبال عظیم چودھری، رخسانہ جبین، ترنم ریاض، فرید پربتی، شفیق سوپوری، نذیر آزاد، طاہر مضطر، احمد شناس، نصرت چودھری، فاروق آفاق، شبنم عشائی، بلراج بخشی، فدا راجوروی، کے ڈی مینی، امین بانہالی، جان محمد آزاد، پریمی رومانی، رفیق انجم، سجاد پونچھی، رفیق ہمراز، نکہت فاروق نظر، لیاقت جعفری، پرویز مانوس، اشرف عادل، خورشید کاظمی، عشاق کشتواڑی، شام طالب، مجید عاصمی، فریدہ کول، بشیر احمد بشیر، غلام نبی غافل، سہیل مہدی، فاروق فدا، غنفر علی شہباز، سید لیاقت نیر، یاسین سمبلی، محتشم احتشام اور عبدالغنی جاگل وغیرہ کے نام شامل ہیں ۔ یہ تمام شاعر اپنے فنی کمال اور ندرت کے باعث اکیسویں صدی میں ریاست کا سرمایہ اور اثاثہ ہیں۔ چنانچہ ان شعرا کے فنی محاسن کا اجمالی جائزہ حسب ذیل ہے۔

عصر حاضر میں ریاست کے شعروادب کی آبیاری کرنے والوں میں کئی نام ایسے ہیں جو اپنے فکر ونظر کے اعتبار سے اہمیت کے حامل ہیں ان میں حامدی کاشمیری کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ ریاستی سطح پر ہی نہیں بلکہ قومی سطح پر بھی جتنی توجہ کے مرکز آپ ہیں اور جتنی شہرت آپ کو نصیب ہوئی وہ اظہر من الشمس ہے۔

حامدی کاشمیری (۱۹۳۶ء) ایک ایسی شخصیت ہیں جو اردو زبان و ادب کے معماروں میں اپنا اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔ آپ کی زیادہ شہرت تو بحیثیت نقاد کے ہے اور آپ کا نام جدید تنقید کے عالمی شہرت یافتہ نقادوں میں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا، پروفیسر گوپی چند نارنگ اور شمس الرحمان فاروقی کے بعد پروفیسر حامدی کاشمیری نے اپنے طبع زاد تر و تازہ انکشافی تنقیدی رجحان کو اختراع کر کے جدید اُردو تنقید کی دُنیا میں اپنا تشخص قائم و دائم کر لیا ہے۔

پروفیسر حامدی کاشمیری افسانہ نویس، ڈرامہ نویس، بہترین انشاپرداز، ممتاز شاعر، اور معتبر نقاد کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ ہر صنف میں منفرد اور دنیائے اردو کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے والی کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کے ادبی فن پاروں کا مطالعہ کر کے اپنی رائے قائم کرنے کے لئے ایک کتاب درکار ہے۔ میرا مقصود صرف ان کی اردو شاعری کو اجمالاً زیر بحث لانا ہے۔ کیونکہ شاعری حامدی کاشمیری کی پہلی محبت ہے اور آپ خود کو تنقید نگار نہیں شاعر کہلانا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ بقولِ پروفیسر مجید مضمر۔

''حالانکہ حامدی کاشمیری خود کو بنیادی طور پر شاعر کہلانا پسند کرتے ہیں''۔ ۳ؔ

مظہرامام اپنے ایک مضمون میں یوں رقمطراز ہیں۔

''میرے نزدیک حامدی کاشمیری کی پہلی شناخت ایک تنقید نگار کی ہے لیکن خود اُن کی رائے اس سے مختلف ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ وہ پہلے شاعر ہیں پھر تنقید نگار۔ بہرحال اپنی جگہ یہ حقیقت ہے کہ وہ بحیثیت ناقد بھی انفرادیت اختیار رکھتے ہیں اور بحیثیت شاعر بھی''۔ ۴ؔ

ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ حامدی کاشمیری کی شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد اپنی رائے اس طرح دیتے ہیں۔

۔۔۔(حامدی کاشمیری) کشمیر کے جدید اردو ادب کی رنگا رنگ شخصیت ہیں۔ وہ افسانہ نگار سے بڑھ کر شاعر اور شاعر سے بڑھ کر افسانہ نگار''۔ ۵ؔ

حامدی کاشمیری نے اپنی ادبی سرگرمیوں کے ان دونوں پہلو کو یکساں اہمیت دی ہے۔ اور دونوں میں انہوں نے تازہ کاری کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔ ملک میں سب سے زیادہ چھپنے والے اور اعلےٰ معیار کے تقریباً سبھی رسائل میں اُن کے تحقیقی وتنقیدی مضامین اور شعری

تخلیقات وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہتی ہیں۔ پروفیسر حامدی کاشمیری کے اب تک سات شعری مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ جو حسبِ ذیل ہیں۔

۱۔ عروس تمنا ۲۔ نایافت ۳۔ لاحرف ۴۔ شاخِ زعفران

۵۔ وادی امکان ۶۔ خوابِ رواں ۷۔ یک شہرِ گماں

ان کی شاعری کے مطالعے سے یہ بات پایہ ثبوت تک پہنچتی ہے کہ حامدی کاشمیری اپنے منفرد اسلوب وآہنگ کی بنا پر جدید اور ما بعد جدید اردو شاعری میں اعلیٰ وارفع مقام پر فائز ہیں۔ آپ اظہاریت کے فطری اصولوں کے تحت تجربات کی تجسیم کو اہمیت دیتے ہیں۔ ان کی شاعری میں عصری آگہی کا اظہار مختلف پہلوؤں سے ملتا ہے۔ عصری آگہی، قدروں کی شکست و ریخت اور زندگی کی لایعنیت ان کی شاعری کے خاص موضوعات ہیں۔ برف، پرندے، نوا، خون، سنگ، وادی، شجر، شعلہ، دشت، چنار، ایسے لفظ پیکر ہیں جن سے عموماً آپ نے اپنی شاعری کو تراشا ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار درج ہیں۔

موجِ انفاس آتشیں ہی نہیں
برف پگھلے گی یہ یقین ہی نہیں

برف سے ڈھک جائیں گے ساتوں پہاڑ
وادی وادی آتشیں ہو جائیگی

گرِ گیا خون بے گناہوں کا
بڑھ گئی اشتہا زمینوں کی

خونِ رخشندہ کو اُچھلنا تھا
ہر حقیقت کو خواب کرنا تھا

یہ زمین دیکھنے میں سبز نظر آتی ہے
دو قدم اور چلو سوختہ پائی دے گی

حامدی کاشمیری کے کلام کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ابتداء سے آج تک تازہ کاری اور نادر کاری کو برقرار رکھا ہے۔ آج کا انسان جس غیر محفوظیت، وحشت اور خوف کا شکار ہے اس کا ذکر تو عصری شاعری میں عام ہے اور حامدی کاشمیری کے ہاں بھی یہ موضوعات ہیں لیکن ان کا اظہار اس طرح کرتے ہیں کہ یہ موضوعات تازہ دم ہو جاتے ہیں۔ جن موضوعات کا انتخاب آپ کرتے ہیں ان سے قاری صدیوں سے واقف ہوتا ہے مثلاً برف باری، موسم برگ وثمر، موت وحیات، خوشی وغم، ظلم و جبر اور سیاست وغیرہ۔ لیکن جب قاری شاعری کا مطالعہ کرتا ہے تو نئے پن اور تازے پن سے دوچار ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہوں چند اشعار۔

روکو نہ میرا راستہ سر سبز جنگلو!
میں دست و پا شکستہ ہوں، پیچھے غنیم ہے

میرے محافظو! خنجر بکف رہو شب بھر
سنا نہیں، وہی آئی باہر سے

سبھوں نے بند کئے اُن پر اپنے دروازے
خبر یہ سب کو تھی، لوٹ آئے تھے سمندر سے

ان کی ایک غزل کے یہ اشعار بھی ملاحظہ کیجئے۔

یہ وقوعے تو آسماں کے ہیں
سانحے اور جسم و جاں کے ہیں
آج انھیں پہلی بار دیکھا ہے
کون ہیں یہ بھلا کہاں کے ہیں

دونوں پاتال میں مقید ہیں
دو ہی کردار داستاں کے ہیں
سایہ سایہ ہے اژدھا صورت
کیا یہ آثار اِسی جہاں کے ہیں؟

اس غزل کی زبان صاف وسادہ ہے لیکن زبان میں داخلی ساخت دیکھئے اور کس طرح اشعار تہہ در تہہ معنویت لئے ہوئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ لفظ اور خیال کا وہی رشتہ ہے جو لباس اور جسم کا، اگر یوں کہا جائے کہ جسم اور روح کا تو بھی بے جا نہ ہوگا۔ اس کا خیال حامدی صاحب کی شاعری میں ہمیں اکثر ملتا ہے۔ انہوں نے الفاظ کو مہارت اور فنکارانہ سلیقے سے استعمال کر کے اپنے حسیات وتخیلات، ولولوں اور امنگوں، محرومیوں، تجربات ومشاہداتِ زندگی کو تخلیقی عمل کی صورت میں پیش کیا ہے۔

وادیوں سے پھول رخصت ہوگئے
پھر وہی ایام بے تابی کے ہیں
☆☆
گونجی دستک کی صدا میں نے دریچہ کھولا
سامنے تکتا ہوا راہ گزر تھا کوئی
☆☆
یہ کوہ نما رات بھلا ٹلے ہو تو کیونکر
اب صبح فروزی کا سہارا ہی نہیں ہے
☆☆
میں کہیں تھک ہار کے بیٹھا نہیں
دیکھ اے دشت طلب میری طرف

ہاں اس لمحے میں ہوتا ہے ستاروں کا نزول
شہر خوابیدہ میں کوئی دل بیدار ہے کیا؟

☆☆

تم نے آنے میں دیر کرلی ہے
ہر نفس کا حساب کرنا تھا

حامدی کاشمیری کی شاعری میں مقامی رنگ، ظلم و جبر، معاشرتی زندگی، سیاسی اور معاشی حالات کا کھل کر اظہار ملتا ہے۔ شاعر ہو یا پھر فکشن نگار کے لئے ضروری ہے کہ اپنی ذاتی زندگی، سماج، عہد اور ماحول میں پیش آنے والے حالات کو باریک بینی سے دیکھے اور ذودِ قلم کرے۔ حامدی کاشمیری بھی ان ہی حالات سے متاثر نظر آتے ہیں مثلاً۔

سیاہ دشت میں نور قمر کہاں تک ہے
یہ ناشناس توقف سفر کہاں تک ہے

☆☆

بھٹکتے پھرتے سیاہی کے دہشت وحشت میں
چراغ راہ گذر ہے یقین نہیں آتا

☆☆

ہوا آ رہی ہے بُو لہو کی
ضرور کوئی اس بستی میں مقتل رہے ہیں

☆☆

جو سمت نما ہو وہ ستارہ ہی نہیں ہے
ظلمت کے سمندر میں کنارہ ہی نہیں ہے

☆☆

سراب و دشت کی ظلمت کا کوئی انت نہیں
بتاؤ روشنی چشم تر کہاں تک ہے

سب کو آشفتہ کار ہونا تھا
دشت کو بے کنار ہونا تھا
☆☆
دشت کی دھوپ سے پگھلتے رہے
ابر کو سایہ دار کرنا تھا
☆☆
یہ کیسی آگ میری خاک میں ہے
فروغ شعلگئی افلاک میں ہے
☆☆
ہے سارا شہر گرد تیرہ میں گم
میں تنہا ہالہ مہتاب میں ہوں
☆☆
فراغت سے عدو بیٹھے ہوئے ہیں
میں اپنے حلقہ احباب میں ہوں
☆☆
مرے سینے میں سب پرندے چھپے
شجر در شجر برف گرتی رہی

اس میں شک نہیں کے حامدی کاشمیری کی شاعری پر ترقی پسندانہ طرز فکر بھی نمایاں دکھائی دیتا ہے۔

ابھی نہ دے مجھے اے دوست! دعوت عشرت
سلگ رہی ہے میرے دل میں آتشِ آلام
☆☆

اُفق پہ چھائی ہوئی تیرگی کے دامن سے
مجھے یقین تھا اُبھرے گی تابناک سحر

☆☆

اور آج ہم جسے سمجھے ہیں صبح نوائے دوست!
یہ صبحِ نو ہے حقیقت میں اِک فریبِ نظر

لیکن ۱۹۶۰ء کے بعد انہوں نے اجتماعیت کے بجائے وجودیت پر زور دیا۔ اور ان کی شاعری میں باطن شناسی کا عمل نمایاں ہے۔ ان ہی کی زبان میں ملاحظہ کیجئے۔

''(۱۹۶۰ء کے بعد)۔۔۔۔۔ میرے رویوں میں بنیادی تبدیلی آنے لگی۔ میں نظریات کی ملمع کاری کو محسوس کر کے وجودی خیالات کی اصلیت کے قریب آنے لگا اور مکاشفانہ آگہی سے حقائق کا ادراک کرنے لگا۔۔۔'' ۶

شاخ زعفران میں انہوں نے بجا طور پر لکھا ہے۔

''میں شاعری کے ابتدائی دور ہی سے ایک بے نام اور نا قابلِ تسخیر جذبے کے تحت خارجی دنیا سے باطن رجوع کرنے پر مائل رہا ہوں۔ داخلیت پسندی کے اس رویئے کے نتیجے میں رفتہ رفتہ میرے وجود کے حجابات اُٹھتے گئے اور میں تخلیق شعر کے عمل کے دوران میں خود پر منکشف ہونے کے معجزاتی عمل سے دوچار ہونے لگا''۔ ۷

پروفیسر مظہر امام یوں کہتے ہیں۔

''ان کی شاعری تحیر و تجسس اور خوف و حراس کے جو مناظر پیش کرتی ہے اس کی نوعیت تخلیقی ہے اور باطن کے اضطراب کی پروردہ ہے''۔ ۸

ان کی شاعری کلاسکی رکھ رکھاو کے ساتھ ساتھ جدید حسیت، اور عصری آگہی اور

وسعتِ مشاہدہ، فکری تنوع اور جدت اسلوب سے مزین ہے۔ان کی زبان، تراکیب، علامات اور استعارات کا جدید استعمال ان کی شاعری کو ایک نیا رنگ عطا کرتے ہیں۔ان کی شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد گر یہ کہا جائے کہ ان کی شاعری میں وطن سے محبت کا اثر صاف دکھائی دیتا ہے تو غلط نہیں ہوگا۔لیکن حامدی صاحب کو صرف ریاست تک محدود رکھنا بے انصافی ہوگی کیوں کہ ان کی شاعری جس طلسمی دُنیا کی سیاحت پر آمادہ کرتی ہے وہاں مقامیت کی حدیں منہدم ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ کشمیر کے صوفی شاعروں کے شعری ورثہ کے علاوہ میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ اور پھر یورپی اثرات سے متعلق تحقیق کی سعی ثابت قدم ہے۔اس طرح حامدی صاحب کے ہزار رنگ ہیں جن کو چھیڑنا نا انصافی کے مترادف ہوگا اور جن کا احاطہ اس مختصر تعارفی خاکے میں نہیں ہوسکتا۔ بالآخر میں اپنے اس طائرانہ جائزہ کا خاتمہ ان اقوال کے ساتھ کرتا ہوں۔

''وہ عصری حقیقتوں کو جذب کرنے کے باوجود انسان کی بنیادی جبلتوں اور عناصر کی آمیزشوں کے شاعر ہیں۔ فطرت کو اس کے ان گنت رنگوں میں لکھتے ہیں اور بصری، حسی تجربوں میں سے گذرتے ہوئے لفظ و معنی کے ماورائی آفاق تلاش کرتے دیکھائی دیتے ہیں۔'' ۹ (بلراج کومل)

''حامدی کاشمیری کی شاعرانہ شخصیت حساس، سنجیدہ اور مفکرانہ ہے''۔۱۰

(پروفیسر مظہر امام)

''حامدی اپنے نظریات کے باعث اپنی طرف مبذول کرانے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ ان کے مداح اور معترض دونوں حلقے موجود ہیں۔لیکن نئی نسل سے تعلق رکھنے والوں میں وہ قدر و احترام سے دیکھے جاتے ہیں''۔ ۱۱ (ڈاکٹر برج پریمی)

رفیق راز:۔حامدی کاشمیری اور حکیم منظور کے بعد آج کی تاریخ میں رفیق راز ریاست جموں وکشمیر میں اُردو کی معیاری شاعری کی پہچان بن چکے ہیں۔رفیق راز کے بارے

میں دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ جتنی عمدہ غزلیں اور نظمیں اُردو زبان میں لکھ رہے ہیں ویسی ہی شاعری کشمیری زبان میں بھی کر رہے ہیں۔ اُردو میں اب تک ان کے دو شعری مجموعے ''انہار'' (۱۹۹۸ء) اور ''مشراق'' (۲۰۰۶ء) کے عنوان سے شائع ہو چکے ہیں۔ اسکے علاوہ ان کے کشمیری میں دو شعری مجموعے ''نئے چھے نالان'' اور ''دستاویز'' منظر عام پر آچکے ہیں۔

رفیقؔ راز گذشتہ کئی دہائیوں سے شاعری کر رہے ہیں اور جدیدیت کے راستے سے آج مابعد جدیدیت تک آئے ہیں۔ رفیقؔ راز کو کشمیر کا مابعد جدید شاعر کہا جاسکتا ہے۔ ثبوت کے طور پر ان کے درج ذیل اشعار سامنے رکھے جاسکتے ہیں۔

جسم کے دشت میں ویرانی جاں بولتی ہے
فرق یہ ہے کہ کوئی اور زباں بولتی ہے
یہ کرشمہ تری تصویر کا ہی لگتا ہے
ورنہ دیوار کسی گھر کی کہاں بولتی ہے

رفیقؔ راز کی غزلوں اور نظموں میں کشمیر کے شناختی امتیازات، تنہائی، ذات کا انتشار وجود کی شکستگی، زندگی کے بے معنی ہونے کا کرب، زمانے کی بے رُخی وغیرہ کا اظہار سکہ بند جدید شاعروں کی طرح فیشن کے انداز میں نہیں ہوا ہے۔ بلکہ یہ سارے عناصر رفیق راز کی غزلوں میں سچے تحقیقی تجربے، جذباتی و حسیاتی شعور اور تہذیب یافتہ کیفیت کے طور پر سامنے آئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رفیق راز اپنے سامنے کی زندگی اور زمانہ سے اپنی غزلوں کے لیے تار و پود حاصل کرتے ہیں لیکن ان کا اظہار اپنی ذات کی گہرائیوں میں موجود منفرد لسانی، فکری، اور اسلوبیاتی رنگ و روش کے ساتھ کرتے ہیں۔ اسی لیے رفیقؔ راز کی غزلوں کی فضا، عام طور پر داستانی، اساطیری اور صوفیانہ نظر آتی ہے۔

ساتھ اب کے کچھ نہیں زادِ سفر بس ہاتھ ہیں
سات سو سالہ پرانا نقشہ تبریز ہے

ملبئہ بغداد سے کرتا ہے تعمیر سخن
تیرے اندر کا بھی شاعر فطرتاً چنگیز ہے

اپنا ہی کوئی درپئے آزاد مجھ میں ہے
مجھ سے ہی کوئی برسرِ پیکار مجھ میں ہے

لوگ مجھ کو دیکھ کر اتنے ہیں کیوں حیران سے
جیسے ناقہ پر میں ہوں ابھی کنعان سے

سر تو لائے ہو بچا کر اے مرے غازی مگر
سر اُٹھا کر چل نہ پاؤ گے یہاں تم شان سے

مشہور نقاد شمس الرحمٰن فاروقیؔ نے بھی رفیقؔ راز کی غزلوں کے مجموعے ''انہار'' کے بارے میں اپنی رائے دیتے ہوئے لکھا ہے۔

''رفیق راز کی غزل گوئی کا سب سے نمایاں پہلو اس کا فکری آہنگ ہے۔ غزل کے بارے میں مدت تک یہ غلط فہمی بعض حلقوں میں رہی کہ اسے سادہ اور اسلوب ہی درکار ہے بعض لوگوں نے تو غزل میں استعارے کو بھی ناپسند کیا ہے بعض لوگوں نے غزل سے تقاضا کیا کہ اس میں صرف آپ بیتی اور ذاتی داخلی وارداتوں پر مبنی مضامین ہوں۔ رفیق راز ان شعرا میں نمایاں ہیں جنھوں نے غزل کے اس روایتی پیکر کو توڑنے اور غزل کی آواز میں توانائی ڈالنے کی کامیاب کوششیں کی ہیں رفیق راز کی عمر ابھی زیادہ نہیں ہے لیکن ان کے لہجے اور افکار دونوں میں تمکین اور پختگی کے آثار نمایاں ہیں گرد و پیش کی زندگی اور شاعر کے احساس اور ذات کا اس سے محاسبہ رفیق راز کی غزل کا خاص موضوع ہے۔ لیکن گرد و پیش کی زندگی کو سیاہ چادر کی طرح اپنے اوپر اوڑھتے نہیں اور نہ وہ اپنے محاربے کو جھنڈے کی طرح اُٹھائے پھرتے

ہیں انھیں اپنے محسوسات اور مشاہدات کو شعر کے قالب میں ڈھالنے میں کوئی مشکل اس لیے نہیں ہوتی کہ وہ شعر کے تقاضوں کو باقی تمام چیزوں پر مقدم جانتے ہیں ان کے شعر کا آہنگ انفعالیت اور بے چارگی کے احساس سے عاری ہے۔ زبان کے ساتھ بھی ان کا رویہ غیر رسمی اور تخلیقی ہے''۔ ۱۲

شمس الرحمٰن فاروقی نے رفیق راز کی غزلوں کے بارے میں عمومی رائے کا اظہار کیا ہے اور ان کی باتوں کا حاصل اتنا ہی ہے کہ رفیق راز جدید تر شاعروں میں ایک ممتاز اور منفرد مقام رکھتے ہیں۔ مشہور نقاد حامدی کاشمیری نے بھی رفیق راز کی انفرادیت کے بارے میں کچھ ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔

''۱۹۸۰ء کے بعد ریاستی اور ملکی سطح پر اُبھرنے والے نئے شعرا میں رفیق راز نے بہت جلد اپنی انفرادیت منوانے میں کامیابی حاصل کی۔ وہ ان معدودے چند نئے شعرا میں نمایاں، امتیازی اور مستحکم حیثیت رکھتے ہیں جو تخلیق شعر میں دو بنیادی لوازم کو عزیز رکھتے ہیں۔ جو شعر میں کسی منصوبہ بندی سے اپنے کسی خیال یا نظریے کو ڈھالنے کے بجائے لفظوں اور پیکروں کو اپنے بل بوتے پر ترکیبی صورت میں ڈھلنے اور نادر کار شعری تجربے میں مقلب ہونے پر اصرار کرتےہیں۔ دوسرے جو روایت کے گہرے شعور کے ساتھ جدت کاری سے کام لیتے ہیں، رفیق راز خارجی زندگی کے خونچکاں واقعات، سانحات اور تضادات کا سامنا کرتے ہوئے ذہنی واردات سے گذرتے ہیں اور گہرے زیاں، خوف، اجنبیت اور دِل گرفتگی سے آشنا ہوتے ہیں تاہم وہ مابعد جدیدیت رویّے کے تحت خواب بینی سے دست بردار نہیں ہوتے ہر چند کہ وہ لمحہ بہ لمحہ 'شکست خواب'' کے المیے کا سامنا کرتے ہیں''۔ ۱۳

رفیق راز اپنی شاعری میں ڈکشن، ہیئت اور آہنگ کے اعتبار سے کچھ نیا اور انوکھا کرنے کی قوت اپنی لسانی تشکیل میں رکھتے ہیں۔ رفیق راز نے عربی، فارسی، اور اردو کی روایتی شاعری کے ساتھ ساتھ صوفیانہ شاعری سے بھی بہت گہرا فائدہ اُٹھایا ہے۔ لیکن اپنے مشاہدے اور ادب میں لسانی سطح پر ہو رہی تبدیلیوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جس جرأت مندی سے انہوں نے شاعری کے مروجہ روایتی پیکروں میں تبدیلی کا سراغ لگانے کی سعی کی ہے جس کی وجہ سے آنے والی نسلوں کے لیے ایک نئی روشنی کی راہ بیدار ہوتی ہے۔

پانی سراب فِکر کی موجوں سے دستیاب
سایہ کیسے ہوئے ہے مسافر پہ گردِ راہ

ردیف اور قافیہ کے حوالے سے اگر دیکھا جائے تو شعر کی داخلی اور صوتی تبدیلیوں پر بھی خاصی توجہ کی ہے۔ جس کی مثال ان کے مجموعہ کلام ''انہار'' کی آخری ۲۳ غزلوں میں دیکھا جاسکتا ہے رفیق راز نے اپنی نظموں میں خارج سے داخل کی طرف رُخ کرتے ہوئے فرد سے کائنات کے رشتے کی دریافت کے سلسلے میں شخص اور جذباتی سطحوں کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔

غرض کہ رفیق راز نے اپنی شاعری میں زمانے کے بدلتے تقاضوں اور شعری روایتوں کی ضرورت اور اہمیت کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے جس سے اُن کی شاعری موجودہ اور آنے والے عہد کے لیے نئے شعری اُفق کی جستجو کے زاویے فراہم کرتی ہے۔ اس سلسلے میں اُن کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہمارے خون کی خوشبو جاگ اٹھے گی
معطر اس سے یہ اکیسویں صدی ہوگی

☆☆

ڈوب ہی جاؤں گا یہ سوچا نہ تھا
یہ سمندر اس قدر گہرا نہ تھا



میں ہی تھا اور میرے خواب تھے
چار سو تیرا دھواں پھیلا نہ تھا

پرتپال سنگھ بیتاب :۔ جموں وکشمیر کے جدید شاعروں میں پرتپال سنگھ بیتاب ان معنوں میں ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں کہ انھوں نے اپنی شاعری کا آغاز ۱۹۸۰ء کے آس پاس کیا لیکن آج تک اُن کی غزلیں اور نظمیں متواتر برصغیر ہندو پاک کے رسائل و جرائد میں شائع ہو رہی ہیں۔ ان کی غزلوں اور نظموں کا پہلا مجموعہ ''پیش خیمہ'' ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا، جسے ادبی حلقوں میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اسکے بعد بیتاب کے کئی شعری مجموعے شائع ہوئے مثلاً ''سراب دوسرا'' (۱۹۸۴ء) ''خودرنگ'' (۱۹۹۵ء) ''موج رنگ'' (۲۰۰۳ء) بیتاب کی نظموں کا مجموعہ ''نظم اکیسویں صدی کی'' (۲۰۰۸ء) میں شائع ہوئی غزلوں کا ایک مجموعہ ''شہر غزل'' کے نام سے زیر طبع ہے۔ پرتپال سنگھ بیتاب کی شاعری کا اندازہ ان کے درج ذیل غزلیہ اشعار سے لگایا جاسکتا ہے۔

مجھے معلوم تھا میں اور سنور جاؤں گا
گھر سے نکلوں گا تو ہر سمت بکھر جاؤں گا
راز موجوں کے سمندر نے بتائے ہیں مجھے
یہاں ڈوبوں گا کہیں اور اُبھر جاؤنگا



کچھ تو ہیں پتھر پریشان آذروں کے درمیان
اور کچھ آزر پریشان پیکروں کے درمیان
جائے حیرت اس نئی تہذیب میں موجود ہے
اک پرانا سا کھنڈر اونچے گھروں کے درمیان

جموں وکشمیر میں اکیسویں صدی کے دوسرے شاعروں کی طرح پرتپال سنگھ بیتاب کی شاعری میں بھی مقامیت، وجود کے دوہرے پن اور مایوس و پژمردگی کے احساسات ملتے ہیں لیکن ان کا اظہار جدید استعاروں کے ساتھ ہوا ہے، مثلاً ان کے یہ اشعار۔

کتنے یگوں کی برف ہے اس کوہسار پر
باطن میں اس کے اب کوئی لاوا نہیں رہا

☆☆

کھودی تھیں ہم نے اپنی روایات کے لیے
یہ کیا ہوا کہ ہم انہی قبروں میں گر گئے

☆☆

وہ قتل کرتا ہے ایک ایک دن میں سو سو بار
کبھی کبھی تو مجھے خوں بہا بھی دیتا ہے

پرتپال سنگھ بیتاب کی شاعری قاری کو متاثر کیے بغیر نہیں چھوڑتی، وہ شدتِ احساس کے شاعر ہیں۔ان کے اشعار میں ذاتی، ناکامی، فلسفہ، سیاست کی ناکامی، تہذیب وثقافت کی ناکامی کی شکل جگہ جگہ اُبھرتی ہے۔

پڑھتے رہے ہمیشہ پرانی کتاب ہم
اور ڈھونڈتے رہے ہیں نیا کوئی باب ہم

☆☆

ہم بس گئے وہاں مگر آباد ہو نہ پائے
کچھ وہ جدید تھا کچھ ہم قدیم تھے

ایسی ہی شاعری کی وجہ سے پرتپال سنگھ بیتاب اکیسوی صدی کے شعراء کی فہرست میں صف اول کے شاعر مانے جاتے ہیں۔انہوں نے سچی اور کھری شاعری کے خزانے میں اضافہ کیا ہے۔

قریہ قریہ ضابطوں کی حکمرانی دیکھنا
پھر ہوا میں چار سو اک بدگمانی دیکھنا
کس طرف سے آیا ہوں رُخ ہے اب کدھر میرا
راستوں کے جنگل میں کھو گیا سفر میرا

بیتابؔ کی شاعری میں جدید رنگ کے ساتھ ساتھ شعری روایات سے رشتہ بھی موجود ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور چیز بیتابؔ صاحب کی شاعری کو جدید شعراء میں امتیاز عطا کرتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ مخصوص علامتوں کو ان مخصوص معنوں میں ہی استعمال نہیں کرتے جو اکثر جدید شعراء نے فرض کر لیے ہیں۔ بلکہ انہیں نئے جدید معنی بھی دیتے ہیں۔ ان کے یہاں سمندر، ہوا، آسمان، سایہ، شاخ، شجر وغیرہ جیسے الفاظ اُس قسم کی فضا اور کیفیت کی نوعیت سے الگ نظر آتے ہیں۔ جس طرح کی فضا اور کیفیت بیتاب صاحب سے بیس پچیس سال پہلے کے جدید شعراء کے کلام میں نظر آتی ہے۔

بلاتی ہیں ہوائیں ہم کو بیتابؔ
مگر ہم تو غبارِ رفت گاں ہیں



نہ دے اونچائی میرے قد کو بے شک
میری ہر شاخ کو لیکن ثمر دے



پرندے ہیں دور بہت آسماں پر
زمین پر تو فقط پرچھائیاں ہیں

غرض یہ کہ جموں وکشمیر میں اکیسویں صدی کی شاعری کو بلندیوں پر پہچانے والے جدید شعراء میں پرتپال سنگھ بیتاب بھی ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔

رفیق راز کے بعد آیاز رسول نازکی کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ آیاز رسول نازکی کی شاعری کے مطالعے سے ایسا لگتا ہے جیسے وہ ایک طویل عرصے سے مشق سخن کر رہے ہوں۔ لیکن انھوں نے چھپنے چھپوانے پر کم توجہ دی ہے۔ اسی لیے اب تک ایاز رسول نازکی کے صرف دو مجموعے ہی منظر عام پر آئے ہیں ''خودرو'' اور ''شام سے پہلے'' ''خودرو'' ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا بہ مشکل سو صفحات پر مشتمل اس مجموعے میں غزلیں اور نظمیں ہیں۔ دوسرے مجموعے ''شام سے پہلے'' میں بھی ایاز رسول نازکی نے ڈیڑھ سو کے قریب غزلیں شائع کی ہیں۔ یہ مجموعہ ۲۰۰۸ء میں شائع ہوا اور بلاشبہ اس مجموعہ کی غزلیں یہ ثابت کرتی ہیں کہ ایاز رسول نازکی صرف جموں وکشمیر کے ہی نہیں بلکہ پوری اُردو دنیا کے حوالے سے چند نمائندہ اکیسوی صدی کے شاعروں میں شمار کئے جانے کا پورا حق رکھتے ہیں۔

آیاز رسول نازکی نے اُردو کے ناقدین اور دانشوروں کی توجہ اس وقت اپنی جانب مبذول کی تھی جب ان کی ایک غزل شمس الرحمٰن فاروقی کی نگرانی میں شائع ہونے والے معروف رسالے ''شب خون'' میں شائع ہوئی۔ اس غزل کی لسانی ساخت، فکری نظام اور فنی دروبست نے لوگوں کو چونکایا۔ اس غزل کے چند اشعار اس طرح ہیں۔

میں سپیدے کا پیڑ ہوں لیکن
برف نے میری ٹہنیاں توڑیں

☆☆

اس کے پردے ہوا ہلاتی ہے
میرے کمرے کی کھڑکیاں توڑیں

☆☆

میرے بچپن میں ایک بوڑھا تھا
اس کے بیٹوں نے لکڑیاں توڑیں

☆☆

وہ اُترنے سے خوف کھاتا تھا
اس نے چڑھتے ہی سیڑھیاں توڑیں

☆☆

اس حویلی کے لوگ سوئے تھے
ہم نے دستک میں انگلیاں توڑیں

☆☆

اسپ تازی نے رات بھر شاید
اپنی مضبوط رسیاں توڑیں

اُردو کے مشہور شاعر اور دانشور فاروق نازکی نے جو اتفاق سے ایاز رسول نازکی کے بڑے بھائی ہیں ایاز رسول نازکی کے مجموعے ''خودرو'' میں ایاز رسول نازکی کا تعارف کرواتے ہوئے بجا طور پر لکھا ہے کہ۔

''ایاز رسول فطرتاً کم گو ہے۔ شعر کہنے میں بخل کی ایک اور وجہ اپنے پیشے سے والہانہ محبت بھی رہی ہے۔ میں اس کی گوئی سے بہت خوش ہوں۔ کم کہنا بہرحال بسیار مگر بے ہودہ گوئی سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ کم کہتا ہے خوب کہتا ہے''۔ [۱۴]

ایاز رسول نازکی کی شاعری میں خوب کی یہ صفت اس لیے بھی پیدا ہوئی ہے کہ وہ دیگر معاصر شاعروں سے الگ انداز میں ذات، زندگی اور زمانہ کو دیکھتے ہیں اور جو کچھ ان کے تجربہ اور مشاہدہ میں آتا ہے اسے وہ الگ الگ زاویوں سے جدید تر زبان اور رویوں کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ انھیں خود بھی اس کا احساس ہے۔

لیکن ایاز رسول نازکی کے یہاں بھی ایسی دلکش اور سنجیدہ غزلیں اور نظمیں ملتی ہیں جن میں فنی اور جمالیاتی تقاضوں کو بڑی مہارت سے برتتے ہوئے جدید تر افکار و خیالات کا اظہار کیا گیا ہے، مثلاً

پہلے جیتے تھے نفرتوں کے بغیر
اب بھی جیتے ہیں چاہتوں کے بغیر
تم پہ ایسا کبھی سماں گذرا
سانس لینا بھی جب گراں گذرا

قول کرتا ہے تو دستور نبھانا ہوگا
سر ہمارا تجھے نیزے پہ اُٹھانا ہوگا
اس کا تابوت اُٹھا پایا نہ بیٹا لیکن
باپ کے قرض کا بوجھ تو اُٹھانا ہوگا

☆☆

ایک جنگل آج بھی ہے میرے خوابوں میں کہیں
سایہ سبب ہے کیا ؟ چشم آ ہو دیکھنا

☆☆

ان کے جذبے سیاستوں کی طرح
پیار کرتے عداوتوں کی طرح

☆☆

اب تو صدیاں گذرتی جاتی ہیں
غیر محسوس ساعتوں کی طرح

دراصل ایاز رسول نازکی کی غزلوں میں راست بیانی اور سادہ گفتاری کی ہی خوبیاں ہیں جو ان کی غزلوں کو جدید سے آگے مابعد جدید غزل بناتی ہیں۔ مشہور ناقد سید محمد عقیل رضوی نے پروفیسر قمر رئیس کی مرتب کردہ کتاب ''معاصر اُردو غزل'' میں لکھا ہے

''جدید سے جدید تر غزلیں جنھیں اب پوسٹ ماڈرنزم کی تخلیق سمجھنا چاہئے۔ ان میں بھی یہ راست اظہاری کی کیفیت پھر سے پیدا ہو رہی ہے۔ شاید غزل کے ابہام سے چھٹنے کے بعد اظہاریت کی تیز لے کا یہ اثر ہوسکتا ہے۔ یہ سبب ابہام کے مسترد ہونے کا بھی ہوسکتا ہے''۔ ۱۵

جموں وکشمیر کے اکیسویں صدی کے شاعروں نے اپنی غزلوں میں موضوع، زبان اور اسلوب کے حوالے سے ساری توجہ صرف اور صرف جدید کاری پر ہی مرکوز رکھی ہے۔ بلکہ مابعد جدید شاعروں کے یہاں مضموں آفرینی اور معنی آفرینی کی خوبیاں غزل کی شعریات کے مطابق بھی نظر آتی ہیں۔ پروفیسر عتیق اللہ نے ایاز نازکی کی غزل کے امتیازات کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''....ان کی زبان اور لہجے کے علاوہ ان کی برجستہ رمزیت فوراً متوجہ کرتی ہے۔ اس بات میں شک وشبے کی گنجائش کم رہتی ہے۔ کہ یہ صرف سخنوری کا نتیجہ نہیں اور نہ خیال آرائی کی منقت کے ترجمان۔ ان میں خالص شعر کے ارتعاش موجود ہیں اور اس لیے اپنی صداقت کا قائل کردیتے ہیں.... مجھے اس مجموعے (شام سے پہلے) کے شاعر کی سہل بیانی نے بھی بہت متاثر کیا ہے.... ایاز نازکی کا صاف وشفاف اسلوب دِل کو بہت لبھاتا ہے لیکن اس کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے لہجے کی عوام نوازی کے باوجود احساس اور تصور کی خواص پسندی کو قربان نہیں کیا ہے۔'' ۱۶

مجموعی طور پر ایاز رسول نازکی کی حالیہ غزلوں اور نظموں کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسے شاعر ہیں جن کے یہاں اکیسویں صدی کا مابعد جدید رنگ وآہنگ تو ہے ہی بحیثیت مجموعی تغزل کی بھی کمی نہیں۔

احمد شناس:۔ احمد شناس کا اپنا ایک خاص مقام ہے رفیق رازؔ اور ایاز رسول نازکی وغیرہ کی طرح احمد شناس گذشتہ ایک دو دہائیوں سے شاعری میں زور آزمائی کر رہے ہیں لیکن پھر بدلتے ہوئے ثقافتی منظرنامے کے سبب جدیدیت سے دور اور مابعد جدیدیت سے قریب ہوتے چلے گئے ان کا شعری مجموعہ ''پس آشکار'' ۲۰۱۰ء میں شائع ہوا۔

''پس آشکار'' بنیادی طور نظموں اور غزلوں دونوں کا مجموعہ ہے۔ لیکن اس میں شامل بعض غزلوں کو جدید غزل بھی کہہ سکتے ہیں لیکن چونکہ احمد شناس کی اکثر و بیشتر غزلوں میں جدیدیت کی شناختی خوبیوں سے انحراف ملتا ہے ساتھ ہی ان کی غزلیں آٹھویں دہائی کے بعد سے ہی منظر عام پر آرہی ہیں اس لیے احمد شناس کو ریاست کے مابعد جدید شعرا کی صف میں ہی رکھا جانا بہتر معلوم ہوتا ہے۔ جدیدیت سے احمد شناس کے انحراف پر روشنی ڈالتے ہوئے جاوید انور نے لکھا ہے۔

> ''احمد شناس نے جدید تہذیب کے اُن عناصر کو اپنی تخلیقات کا محور و مرکز نہیں بنایا ہے جو متروکیت (Obsole) کو راہ دیتے ہیں بلکہ تہذیب کے ان عناصر پر توجہ کی ہے جو بڑی غور و فکر اور مشاہدے کے بعد وجود میں آئے اور جدید تہذیب کا حصہ بنے ہیں۔ ''بشر دوستی'' اور روشن فکری (Enlightenment کو بھی احمد شناس نے اپنے اشعار میں جگہ دی ہے''۔ ۱۷

اس سلسلے میں احمد شناس کے درج ذیل اشعار قابل غور ہیں۔

یہ کیسا پیاس کا موسم ہے احمد
سمندر دیدہ تر نہ پہنچا

غرق کرتا ہے نہ دیتا ہے کنارہ ہی مجھے
اس نے میری ذات میں کیسا سمندر رکھ دیا

احمد شناس نے اپنی نظموں میں تیزی سے بدلتے ہوئے سماجی اور تہذیبی حالات کو اپنی ذاتی فکر اور احساس کے ساتھ بیان کیا ہے۔

بستیوں میں جابجا دیکھی ہے فصل تشنگی
پھول شاہد ہوں وہاں میرا جہاں سایہ نہ تھا

☆☆

زمانہ لوٹ کر ڈھونڈے گا خود کو ان خرابوں میں
امانت کی طرح محفوظ رکھنا یاد لمحوں کی

☆☆

باقی ہر رشتہ ہماری زندگی کا ہے اٹوٹ
ایک سانس کا تعلق ہے کہ بس کمزور ہے

☆☆

ہمیں جغرافیہ پڑھنا تھا احمد
مگر تاریخ کا غم لگ گیا ہے

ایک اور اہم بات یہ ہے کہ احمد شناس کی شاعری میں ''ذات'' یا فرد کا تصور محدود نہیں بلکہ ذات یا فرد ایک آفاقی استعارے کے طور پر ظہور پذیر ہوتا ہے جو جدیدیت کی شعریات کے منافی اور مابعد جدیدیت کے موافق ہے۔ احمد شناس کے یہاں معاشرتی اور ثقافتی اقدار ہی نہیں مذہبی عقائد اور روایات تک کی بھی پاسداری ملتی ہے لیکن کسی بھی طرح کے کٹرپن Dogmatism کے بجائے آزاد ادرک اور محابہ جذباتی و احساساتی آمد کے ساتھ ملتا ہے۔

لفظ جب اُترا مری آنکھیں منورّ ہو گئیں
لفظ احمد زندگی سے رابطے کی ڈور ہے

☆☆

میں سامنے ہوں، وہ میرے اندر چھپا ہوا ہے
میں اس کی تخلیق ہوں وہ میرے خیال

☆☆

اس زمین پر ایک پرچھائی لئے پھرتا ہوں میں
کیا خبر اس نے کہاں مجھ کو بنا کر رکھ دیا

☆☆

سنا تھا تجھ سے اپنا نام تو "شہ کار" میں نے
زمیں کا بوجھ لکھا خود کو آخر کار میں نے

دراصل احمد شناس کی شاعری روایتی کلاسیکی ترقی پسند یا جدید شاعری کی طرح پہلی قرات یا سماعت میں مسرت یا بصیرت سے سرشار کر دینے والی شاعری نہیں ہے بلکہ ایسی شاعری ہے جو قاری کو لفظ لفظ کھول کر دیکھنا ہوتا ہے مثلاً

پس خیال ہوں کتنا ظہور کتنا ہوں
خبر نہیں کہ ابھی خود سے دور کتنا ہوں
یہی سطور ہیں یری کہ حرف باقی بھی
میں واہمہ ہوں کہاں تک ضرور کتنا ہوں

احمد شناس نے "پس آشکار" میں اپنی شاعری اور اپنے شاعرانہ وجود سے متعلق جو چند باتیں اپنے وضاحتی، بیانات میں کھولی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ "پس آشکار" کی تخلیق کے پس پردہ احمد شناس کی وہ بصیرتیں بھی کارفرما ہیں جو انھوں نے قران مجید، سیرت رسولؐ کے علاوہ، کلام اقبال اور مولانا وحید خان کی تحریروں سے حاصل کی تھیں۔ اور یہ تو پتہ ہے کہ احمد شناس کی شخصیت اور شاعری کا خمیر کشمیر (ریاست) سے ہی اُٹھا ہے لہٰذا گذشتہ دو ڈھائی دہائیوں سے کشمیر جس بحران سے گذر رہا ہے، احمد شناس نے اپنی شاعری میں اس کرب کو بڑی مہارت کے ساتھ

سمیٹا ہے۔ محمد یوسف ٹینگ نے پس آشکار کے پیش کلام میں دُرست لکھا ہے کہ۔

''شاعر (احمد شناس) کشمیر کی مٹی کو مٹھی میں لے کر بو باس کو شعر کے رگ وریشے میں INJECT کرتا ہے تو اس میں انفرادی دُکھ درد کے ساتھ انسانی کرب کی لہریں مچلتی ہیں۔ ایسے اشعار کے اندر کشمیر کے زخم لو دیتے ہیں۔ لیکن انھیں ان قدروں اور بڑے تناظر کے ساتھ جوڑنے میں بھی کوئی مشکل نہیں ہوتی۔ اس وقت دنیا میں نرم جذبات، اچھی قدروں اور بڑے آدرشوں کی جو شکست وریخت ہو رہی ہے وہ جیسے روحانی سطح پر ایک ''سونامی'' کی گرج کا سراغ دے رہے ہیں''۔ ۱۸

محمد یوسف ٹینگ کے علاوہ پروفیسر حامدی کشمیری اور پرتپال سنگھ بیتاب نے بھی احمد شناس کی شاعری کے بارے میں اپنے حوصلہ بخش تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ ویسے تو ''پس آشکار'' میں چند ایک نظمیں اور متفرق اشعار بھی شامل ہیں۔ لیکن بنیادی طور پر پس آشکار غزلوں کا مجموعہ ہے اور احمد شناس کے شاعرانہ انفراد کو ثابت کرتا ہے۔ لیکن آج کی تاریخ میں کسی بھی جنیوین غزل گو جیسے کہ احمد شناس ہیں، دو اور دو چار کی طرح مقام اور مرتبہ کے تعین کا عمل عمدہ غزل کی تخلیق کے عمل سے زیادہ دُشوار ہو گیا ہے اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ احمد شناس جیسے منفرد سوچ اور اسلوب کے پُر گو شاعر کے تخلیقی شعور میں غزل کی روایات اور انحراف رسومات اور اجتہادات تک بہت کچھ سرگرم اور متحرک رہتا ہے جو انھیں ایک الگ زاویئے سے تخلیق شعر کی تحریک دیتا رہتا ہے لیکن یہ اتنا آسان نہیں۔ چنانچہ ایماندارانہ طور پر دیکھیں تو غزل کے بڑے شاعروں، ولؔی۔ میرؔ، غالبؔ، اور اقبالؔ سے لے کر فراقؔ، جگرؔ اور شادؔ عظیم آبادی تک ۔نے غزل کو فنی، لسانی موضوعاتی اور جمالیاتی اعتبار سے جن بلندیوں تک پہنچایا تھا آج کا کوئی بھی شاعر کسی بھی پہلو سے اُن کے آس پاس بھی نہیں پھٹکتا۔ البتہ کبھی کسی نے میرؔ کے تتبع کو اپنی شاعری کی معراج سمجھ لیا تو کبھی کسی نے دوستوں کے اس مذاق کو سچ سمجھ لیا کہ اس

کی شاعری غالبؔ سے بڑی شاعری ہے لیکن سچ تو یہ ہے کہ گذشتہ نصف صدی میں غزل گوئی کے حوالے سے شہرت تو کئی شاعروں کو ملی لیکن خود غزل کے ایوان میں امکانات کے نئے چراغ کم ہی روشن ہو سکے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اُردو غزل کی زمین بنجر ہو چکی ہے یقینی طور پر مظہر امام، ناصر کاظمی، باقی احمد فراز، ظفر اقبال، شہریار اور پروین شاکر کے بعد کے شاعروں میں اسعد بدایونی، عبدالاحد ساز، رفیق راز، ایاز نازکی وغیرہ کے ساتھ ساتھ احمد شناس بھی اکیسویں صدی کے ثقافتی صورت حال میں غزل اور نظم کو نئی جہات سے روشناس کروانے میں ایک اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ ''پس آشکار'' کی غزلیں اور نظمیں اس کی گواہ ہیں۔

پروفیسر نصرت چوہدری:۔ نصرت آرا چودھری جموں وکشمیر کی ایک ذہین شاعرہ ہیں۔ کم لکھنا اور اچھا لکھنا ان کا طریقہ رہا ہے۔ نصرت چودھری یوں تو کئی دہائیوں سے لکھ رہی ہیں۔ لیکن اب تک ان کا صرف ایک ہی شعری مجموعہ ''ہتھیلی کا چاند'' کے نام سے ۲۰۰۸ء میں شائع ہوا ہے۔ اس مجموعے میں ان کی غزلیں اور آزاد نظمیں شامل ہیں۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہ غزل کی اچھی شاعرہ ہیں یا نظم کی۔ لیکن یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ان کی غزلوں میں جدید رنگ و آہنگ کے ساتھ ساتھ مابعد جدید شاعری کے عناصر بھی ملتے ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انہوں نے اپنے تجربات و مشاہدات کو بڑی سچائی کے ساتھ غزل کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ نصرت چودھری صاحبہ نے اپنے شعری مجموعہ ''ہتھیلی کا چاند'' کے دیباچے میں خود لکھا ہے۔

''جہاں تک میری شاعری کا تعلق ہے، ہوسکتا ہے کچھ لوگوں کو یہ ضرورت سے زیادہ داخلی نظر آئے۔ لیکن ایک بات جس پر میں بجا طور پر فخر کر سکتی ہوں وہ ہے۔ میری شاعری کی سچائی۔ اس میں کوئی بناوٹ نہیں۔ کوئی چھل کپٹ یا ریاکاری نہیں۔ میں نے ہر احساس اور جذبے کو اپنی ذات کے حوالے سے دیکھا ہے۔ اور جو محسوس کیا ہے۔ اپنے

محدود الفاظ کا سہارا لے کر انہیں پیش کر دیا ہے۔ میرے سبھی تجربات
میں چاہیئے آپ کو کوئی تنوع نظر نہ آئے۔ لیکن ان کی بے ساختگی اور
اظہار رائے کی آزادی یقیناً آپ کو متاثر کرے گی۔''......۱۹

مذکورہ بالا اقتباس میں انہوں نے اپنی شاعری کے امتیازت کی نشاندہی خود کی ہے۔ اوران کی شاعری کے مطالعے سے ثابت بھی ہوتا ہے کہ اپنی شاعری سے متعلق ان کی وضاحتیں یا دعوے غلط بھی نہیں ہیں۔ اس کا اندازہ ان کے اشعار سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

جو لوگ کسی شے کی تمنا نہیں کرتے
خوابوں کے دریچے سے وہ جھانکا نہیں کرتے

☆☆

جب مجھ سے ہم کلام میری خامشی ہوئی
بکھرے ہوئے وجود سے شرمندگی ہوئی

☆☆

دُکھ دیتے دیتے اہلِ جہاں مجھ کو تھک گئے
اپنے غموں پہ اس لیے ہنستی رہی ہوں میں

نصرت آرا نے ایک عورت ہونے کے ناطے عورت کی زندگی میں رونما ہونے والے واقعات کو سمجھا۔ جس میں اس کا کرب بھی ہے، رنج بھی، اورنا اُمیدی بھی، دُکھ کے لمحوں میں بھی وہ نا اُمید نہیں ہونے دیتی بلکہ جینے کی اُمنگ پیدا کرتی ہیں۔ انسان چاہیے زندگی کے کسی بھی مقام پر کیوں نہ پہنچ جائے اُس کے احساسات، جذبات، اور تجربات ہمیشہ اس کے اپنے ہوتے ہیں۔ اورانھیں استعمال کرنے کا طریقہ بھی اُس کا اپنا ہوتا ہے۔ جس طرح ہرانسان کے ہاتھوں کی لکیروں کے نشان ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں اسی طرح اُن کے اظہار کرنے کا طریقہ بھی الگ ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ اظہار کا طریقہ تو بدل سکتا ہے مگر اس کا

سلسلہ جاری وساری رہتا ہے۔

نصرتؔ چودھری نے جس طرح اپنی غزلوں میں رشتوں کو مدِ نظر رکھا اور اُن میں رونما ہونے والے واقعات کو بیان کیا اور عورت ذات کا استحصال، اس کی بے راہ روی، دردمندی، ذلت اور رسوائی کو اپنی غزلوں میں جس طرح بروئے کار لایا۔ ریاست کے حوالے سے بہت کم خواتین شاعرات نے اس بات کو مدِ نظر رکھا ہے حالاتِ حاضرہ پر نصرتؔ چودھری کی نظر کافی گہری ہے۔ وہ جانتی ہیں کہ آئے دن اس زمین پر انسان کا خون کس طرح بڑی بے دردی سے بہایا جا رہا ہے۔ وہ ان حادثات اور واقعات کو دیکھ کر تڑپ اٹھتی ہیں زندگی کے غموں کو سہتے سہتے جب اُن کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے۔ تو یہ کہنے پر مجبور ہو جاتی ہیں کہ ؎

جن پہ لکھے ہیں نام رشتوں کے
میرے سینے میں ایسے خنجر ہیں
روزِ محشر سے کیا ڈراتے ہو
میرے آنگن میں سارے محشر ہیں
اُن کے چہرے کو جب سے دیکھا ہے
آسماں چپ بُجھے سے اختر ہیں
جانے کیسے سفر میں ہوں نصرتؔ
سارے منظر اُداس منظر ہیں

نصرتؔ چودھری نے اگر چہ اپنی غزلوں میں موضوعات کے حوالے سے بحث کرنے کی کوشش کی ہے اور اُسے اپنی غزلوں میں برتا بھی ہے۔ جسکی وجہ سے اُن کا شمار ریاست میں اہمیت کا حامل ہے غزلوں کی طرف ان کا رجحان اگر چہ کم رہا ہے لیکن اس کے باوجود اُن کا شعری مجموعہ ''ہتھیلی کا چاند'' قابلِ اعتماد ہے۔ نصرتؔ چوہدری کے یہاں عصرِ حاضر کے شناختی امتیازات، تنہائی، ذات کا انتشار وجود کی شکستگی، زندگی کے بے معنی ہونے کا کرب، زمانے کی

بے رُخی وغیرہ کا اظہار سکہ بند جدید شاعروں کی طرح فیشن کے انداز میں نہیں ہوا ہے۔ بلکہ یہ سارے عناصر نصرتؔ چوہدری کی غزلوں میں سچے تحقیقی تجربے، جذباتی وحسیاتی شعور اور تہذیب یافتہ کیفیت کے طور پر سامنے آئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نصرتؔ چوہدری کشمیر کی عصری سماجی وثقافتی صورتِ حال سے بھی اپنی غزلوں کے لیے تار و پود حاصل کرتی ہیں لیکن ان کا اظہار اپنی ذات کی گہرائیوں میں موجودہ منفرد لسانی، فکری، اور اسلوبیاتی رنگ وروش کے ساتھ کرتی ہیں۔ اسی لیے نصرتؔ چوہدری کی غزلوں کی فضا، عام طور پر رومانی اور نسوانی نظر آتی ہے۔ لیکن ان اشعار کی گہرائی میں جا کر غور کریں تو ان میں کشمیر کی ظاہری فضا اور عصری حالات اور رسائل کی عکاسی بھی نظر آئے گی۔ جس کی چند مثالیں درجہ ذیل ہیں۔

اپنی ہی گرمی سے جل کر اس طرح سوکھا چنار
دیکھتے ہی دیکھتے پھر ہو گیا تنہا چنار

جس کے سائے میں کسی نے پیار کا رستہ چنار
یاد آئے گا مجھے برسوں وہی اونچا چنار

لوگ دنیا کے عجائب دیکھ کر آئے تو ہیں
کس نے کیا دیکھا اگر اب تک نہیں دیکھا چنار

دھوپ کی مسموم شدت سے وہ اندھا ہوگیا
جاگتی آنکھوں سے جس نے کٹتے دیکھا تھا چنار

نصرتؔ چودھری نے زیادہ تر آزاد نظم کی ہئیت میں نظمیں لکھی ہیں۔ نصرتؔ چودھری کے شعری مجموعہ ''ہتھیلی کا چاند'' میں کُل ستائیس نظمیں شامل ہیں جن میں زیادہ تر آزاد نظم کی شکل میں لکھی گئی ہیں۔ جن میں ''ہتھیلی کا چاند''، ''پاگل خواب''، ''زندگی''، ''زنجیر''، ''خود فریبی''، ''وفا''، ''دستک''، ''عید کا دن''، ''سِل''، ''آرزو''، ''قیدی''، ''سفر آئینہ کا''، ''گر وقت ملے تو میں''، ''برہن''، ''قیدی لمحے''، ''اللہ والی''، ''غم''، ''تم سچے تھے''، ''وہ لمحہ''، ''یاد کا چاند''، ''سچی

کہانی"، "چیپ کے مکانوں کے قیدی"، "قیدی"، "پھر کہو"، اور "خالی کلائی" قابلِ ذکر ہیں۔

نصرتؔ چودھری نے اپنی نظموں کو آزاد نظم کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ جس سے اُن کی نظموں کی خوبصورتی بڑھ جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے نئی نظم نگار خواتین میں ان کا مقام اہمیت کا حامل بن جاتا ہے۔ نصرتؔ آرا نے اپنی نظموں میں محرمیوں، ناکامیوں، اندیشوں اور حسرتوں کا ذکر کیا ہے۔ وہ اپنی نظموں میں مشکل الفاظ کا استعمال نہیں کرتی بلکہ عام بول چال کی سادہ زبان میں اتنی مٹھاس کا رس بھر دیتی ہیں کہ ہر دل عزیز کی زبان بن جاتی ہے۔ اُن کی نظموں میں ایک عورت کی ذاتی زندگی کے تجربات اور مشاہدات جلوہ گر ہیں۔ جس میں عورت کی زندگی میں پیش آنے والے مسائل کو منظرِ عام پر لایا گیا ہے۔

اس دور میں عورت پر ہو رہے ظلم وستم اور عورت کے ذاتی مسائل پر اُن کی گہری نظر ہے یوں کہنا بے جا نہ ہوگا کہ انہوں نے عورت کے مسائل کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے۔

نصرتؔ کی ان نظموں میں چند ایسی نظمیں بھی شامل ہیں جن کو پڑھنے کے بعد درازوں سے ایک آہٹ دل میں اُتر کر خاموش اُداس چہرے سے یہ کہہ رہی ہوگی کے اگر وقت کی اس اندھی دوڑ میں فرصت ملے تو میری بھی سنو۔

ان نظموں کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ قاری سے ہم کلام ہوتی ہیں اور زندگی کے نگار خانے کی سیر کراتی ہیں۔ ازدواجی رشتے دونوں فریقین کی مرضی کے مطابق نہیں ہوتے تو اُن کی زندگی کس طرح اجیرن بن جاتی ہے۔ اس کے علاوہ بہت سی نظموں میں نسوانی کردار کی شکست وریخت کو نظمایا گیا ہے۔

اس طرح سے مختصر طور پر کہا جا سکتا ہے کہ نصرتؔ آرا جموں وکشمیر کے اکیسویں صدی کے شاعروں میں بلند مقام رکھتی ہیں۔ خصوصاً صوبہ جموں کی خواتین شاعرات میں اُن کا اہم نام ہے۔ جنہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے عورتوں کے احساسات وجذبات کو پیش کیا ہے۔ نصرتؔ کی شاعری میں بغاوت بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ لیکن وہ نعرے بازی کے انداز میں نہیں بلکہ

پُرامن طریقے سے عورت کو بغاوت کی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ اس لئے نصرت چودھری کا جدید دور کے بلند پایہ کے شاعروں اور نقادوں میں شمار ہوتا ہے۔

رخسانہ جبیں :۔ جموں و کشمیر میں اکیسویں صدی کی اُردو شاعری میں جو نئے نام نمایاں ہوئے ان میں ایک نام رخسانہ جبیں کا بھی ہے۔ رخسانہ جبیں غزلیں بھی لکھتی ہیں اور نظمیں بھی۔ چونکہ رخسانہ جبیں بھی ایک تعلیم یافتہ خاتون ہیں اور ساتھ ہی ریڈیو کی ملازمت کی وجہ سے ریاستی، ملکی اور بین الاقوامی حالات کی بھی معلومات رکھتی ہیں۔ لٰہذا یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ زبان، لب ولہجہ اور فکر وخیال کے اعتبار سے ان کی غزلوں کو مابعد جدید غزل کا نام دیا جا سکتا ہے۔ رخسانہ جبیں کا ابھی تک کوئی مجموعہ کلام شائع نہیں ہوا ہے لیکن ان کی غزلیں اور نظمیں ادبی رسالوں میں چھپتی رہتی ہیں۔

کشمیر کی اکیسویں صدی کی شاعرات کی شاعری کا رنگ و آہنگ ان سے ملتا جلتا ہے۔ لیکن کشمیر کی مابعد جدید شاعرات فیشن کے طور پر اپنے عورت ہونے کی بنا پر مظلوم ہونے کے احساس کو ہر وقت لادے نہیں رہتیں۔ ان کی اکثر و بیشتر غزلیں ایسی ہیں جو انھوں نے ایک آزاد، باشعور اور حساس ''ذات'' کے طور پر لکھی ہیں۔ نصرِت چودھری کے بعد اس کی عمدہ مثالیں رخسانہ جبیں کے یہاں ملتی ہیں مثلاً۔

ہمارے شہر پہ اب کس کی حکمرانی ہے
کہ آفتاب فسانہ، کرن کہانی ہے
ہمارے زخم نہ آنسو ہی دیکھے جاتے ہیں
وہ مہرباں ہے تو کیوں حکمِ بے زبانی ہے

☆☆

بدلی رُت کے تقاضوں سے تو پریشاں ہے
میں مطمئن ہوں خدا نے مزاج سادہ دیا

رخسانہ جبیں کی شاعری کی بنیادی خوبی ان کی سادگی ہی ہے۔ عام طور پر وہ پیچیدہ اور مبہم علامتوں اور استعاروں کے استعمال سے پرہیز کرتی ہیں اور جو علامتیں وہ لاتی ہیں ان کا سماجی اور تہذیبی پس منظر قاری کی سمجھ میں آتا ہے۔ اس اعتبار سے رُخسانہ جبیں کی غزلیں اور نظمیں موجودہ عہد کی غزل کی سادگی اور سہل بیانی کی عمدہ مثال کہی جاسکتی ہیں۔ رُخسانہ جبیں نے اپنی ذات کے حوالے سے محسوسات کا اظہار تو کیا ہی ہے ان محسوسات کے پردے میں زندگی اور زمانہ کی بے وفائی کا شکوہ بھی کیا ہے رُخسانہ جبیں کا انداز بیان وہی ہے جو کشمیر کے دوسرے موجودہ عہد کے شعراء کا ہے لیکن رخسانہ جبیں نے چونکہ اپنی غزلوں میں تانیثی سوچ اور فکر کے عناصر بھی محسوس یا نامحسوسانہ طور پر شامل کئے ہیں اس لیے رُخسانہ کی شاعری میں ایک ندرت پیدا ہوگئی ہے مثلاً ؂

یہ احوال پُرسی زباں کھینچ کر
نہ رکھ دے ہیں میری جاں کھینچ کر

☆☆

کچھ ایسی اُس نے اب اپنے دِل میں ٹھانی ہے
ہمیں بھی درد کی دنیا الگ بسانی ہے

☆☆

ہمارے شہر پہ اب کس کی حکمرانی ہے
کہ آفتاب فسانہ کرن کہانی ہے

☆☆

جدا ہوئے تو ملاقات بھی نہیں ہوگی
گذرتے وقت کے دریا میں وہ روانی ہے

رخسانہ جبین کی شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد فرید پربتی اپنے ایک مضمون میں یوں رقمطراز ہیں۔

''ان کی شاعری میں فنی ارتکاز اور فکری تجدد کے ساتھ ساتھ عصری آگہی کے عمدہ نمونے بھی ملتے ہیں۔ وہ اپنی شاعری کو اعترافی رویوں تک ہی محدود نہیں رکھتی ہیں بلکہ دیگر تجربات سے بھی اپنی شعری کائنات مزین کرتی ہیں۔ ۲۰

خالد بشیر:۔ بلاشبہ ریاست کے ان ادباء کی فہرست میں شمار کیے جا سکتے ہیں جنہیں نظم ونثر پر یکساں دسترس حاصل ہے۔ خالد بشیر نے اپنی فنکارانہ صلاحیتوں اور تخلیقی کاوشوں سے اُردو شعروادب کے سرمائے میں جو اضافہ کیا ہے وہ قابل قدر بھی ہے اور لائق تحسین بھی۔ انہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز اگرچہ افسانہ نگاری سے کیا لیکن بہت جلد وہ شعر گوئی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ان کی شاعری کے دو مجموعے ''صدائے نیم شب'' اور ''خواب پارہ'' شائع ہو کر داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

خالد بشیر احمد کا پہلا شعری مجموعہ ''صدائے نیم شب'' مارچ ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کی دوسری اشاعت مارچ ۲۰۰۹ء میں عمل میں لائی گئی ہے۔ اس کا ناشر بک مین پبلشرز، ۲۹۴ نرسنگھ گڑھ، سرینگر ہے۔ ۸۸ صفحات پر مشتمل اس شعری مجموعے کے اولین آٹھ صفحات اندرونی سرورق اور مختصر سے انتساب کی نذر ہوئے ہیں۔ مجموعے کے صفحہ ۹ سے ۱۳ تک پروفیسر حامدی کاشمیری کا لکھا ہوا فکر انگیز مقدمہ ہے۔ صفحہ ۱۴ پر شاعر نے اپنے اس مجموعے کے بارے میں ''ایک بات'' عنوان کے تحت اظہارِ خیال کیا ہے۔ اس کتاب کی کمپیوٹر کمپوزنگ اور سرورق کو احمد اور فیاض نے انجام دیا ہے۔

''صدائے نیم شب'' کے صفحہ ۱۵ پر مختصر سا پیش لفظ ہے جو کہ نہایت ہی دلچسپ اور معنی خیز ہے۔ دراصل یہ پیش لفظ ایک آزاد نظم ہے جو شاعر کے خیالات اور جذبات کی ان الفاظ میں ترجمانی کرتی ہے۔

میں ازل سے

ایک ایسی زمین کی تلاش میں تھا
جہاں سورج کی سُلگتی ہوئی تمازت سے بچنے کے لیے
میں ایک شجر سایہ دار اُگا لیتا
میرے اس سفر میں
میرے ہمراہ
صرف ایک بے سر دھڑ کا شخص تھا
جس کا بدن خوشبو
اور جس کا لمس احساس تھا
یہ شخص مجھے ایک ایسے جزیرے تک لے آیا
جہاں کی زمین بڑی حساس اور نم تھی

زیر بحث شعری مجموعے کا صفحہ ۱۶ خالی ہے۔ صفحہ ۱۷ سے ۶۵ تک ۴۹ غزلیں موجود ہیں جن میں ۲۶ پانچ اشعار کی، ۱۵ چار اشعار کی اور آٹھ غزلیں صرف تین اشعار کی ہیں صفحہ ۶۶ سے ۶۸ تک گیارہ متفرق اشعار ہیں اور صفحہ ۶۹ سے ۸۷ تک گیارہ آزاد اور نثری نظمیں ہیں۔ صفحہ ۸۸ پر شاعر کی مختصر سی سوانح درج ہے۔ صدائے نیم شب کو جموں وکشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز کی طرف سے ۱۹۸۳ء میں سال کی بہترین اُردو کتاب کا ایوارڈ حاصل ہوا ہے۔

''خواب پارہ'' خالد بشیر احمد کا دوسرا شعری مجموعہ ہے جو ۲۰۰۸ء میں شائع ہوا ہے۔ اس مجموعے کی طباعت جے کے آفسیٹ پرنٹرس، جامع مسجد دہلی کے زیر اہتمام ہوئی ہے۔ اس کا ناشر بھی بک مین پبلیشرز ۲۹۴، نرسنگھ گڑھ، سرینگر ہے۔ اس کتاب کی کمپوٹر کموزنگ اور سرورق فیاض، ساجد اور زُہیب کے مرہون منت ہے۔

خالد بشیر کا یہ مجموعہ ۱۲۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ شروع کے سات صفحات اندرونی سرورق اور انتساب پر مشتمل ہیں۔ خواب پارہ کا صفحہ آٹھ خالی ہے۔ صفحہ ۹ اور ۱۰ پر دو حمد ہیں جس

کے اشعار عشقِ الٰہی کے جذبات سے سرشار ہیں۔ نمونتاً یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

وہ پیاس دیتا ہے تو اس کے بعد پانی بھی
اسی یقین پر ہے میری خوش گمانی بھی
نہیں ہے اُس کے سوا لائقِ سجود کوئی
وہ لاشریک بھی، واحد بھی، غیر فانی بھی
فرشِ زمین تا عالم بالا اللہ تعالیٰ آپ کا نام
سب سے ارفع سب سے اعلیٰ اللہ تعالیٰ آپ کا نام
صبح ازل سے شام ابد تک رہنے والی آپ کی ذات
اُس کے بعد بھی رہنے والا اللہ تعالیٰ آپ کا نام

خواب پارہ کے صفحہ ۱۱/اور ۱۲/ پر دو نعتیں شامل اشاعت ہیں، ان میں سے ایک نعت کے یہ دو شعر ملاحظہ ہوں۔

صورتِ حال ہے غم ناک، رسولِ عربیؐ
دامنِ صبر بھی صد چاک رسولِ عربی
داورِ حشر بھی بخشے تو سفارش پہ تیری
میرے اعمال شرمناک، رسولِ عربیؐ

خواب پارہ میں صفحہ ۱۳/ سے ۹۵ تک ۸۳ غزلیں ہیں جن میں سے ۳۶ کے پانچ، ۲۶ کے چار اور ۲۱ کے تین اشعار ہیں۔ صفحہ ۹۶ تا ۱۰۶ پانچ نظمیں ہیں اور صفحہ ۱۰۷ سے ۱۲۰ تک متفرق اشعار شامل ہیں۔ خالد کے دونوں مجموعوں میں ایک بھی شعر مقطع کا نہیں ہے۔

جہاں تک خالد بشیر کے ان شعری مجموعوں ''صدائے نیم شب'' اور ''خواب پارہ'' کا تعلق ہے، ان کے گہرے مطالعے کے بعد قاری اس حقیقت سے آشنا ہوتا ہے کہ خالد بشیر ریاست جموں وکشمیر کے شعراء میں جدید حسیت اور عصری آگہی کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری

میں عصر حاضر کے انسان کی نامرادیوں، ناکامیوں اور محرومیوں کے ساتھ ساتھ جدید حسیت کا شدید احساس ملتا ہے اور احساس کی یہ شدت ان کی ذات کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ خالد نہ صرف اپنے عصری حالات سے پوری طرح آگہی رکھتے ہیں بلکہ وہ اپنے عہد کی زندگی کے ایک ایک پہلو پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ان کی شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد قاری کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ گرد و پیش کی دنیا کا مشاہدہ اور نظارہ کر رہا ہے کیونکہ خالد بشیر نے اپنے عہد کے انسان کے درد و کرب کو بڑی شدت سے محسوس کیا ہے۔ انہوں نے انسان کو طرح طرح کے مصائب اور مسائل سے نبرد آزما ہوتے دیکھا ہے۔ وہ خود جس سماج اور ماحول کا حصہ ہیں، اس کی اونچ نیچ، طبقاتی کشمکش اور سماجی نابرابری کا انہوں نے قریب سے مشاہدہ کیا ہے۔ چنانچہ ان کی شاعری ان کے وسیع مطالعے اور گہرے مشاہدے کی غماز ہے۔ انہوں نے اس دنیا میں جس بات، واقعے اور حادثے کو، جس طرح محسوس کیا ہے، اسے شعری پیکر عطا کر کے من و عن پیش کرنے کی کامیاب سعی کی ہے۔

خالد بشیر کا پہلا شعری مجموعہ ''صدائے نیم شب'' اُن کے ابتدائی اڑھائی برس کی شاعری کا انتخاب ہے۔ یہ مجموعہ اگرچہ ان کے دورِ شباب کا ہے لیکن بقولِ پورن سنگھ ہنر۔

> ''اس میں عشوہ و غمزہ و ادا، جبین و سنگ در، عارض و رُخسار، کاکل، شب رنگ، گیسوئے عنبریں، ہجر و وصال، قلق و اضطراب، حسرت و حرماں کا تذکرہ عنقاء و معدوم ہے۔'' ۲۱

''صدائے نیم وشب'' کے ہر صفحہ پر حسی تجربات کی ایسی انوکھی اور اچھوتی مثالیں موجود ہیں، جو خالد بشیر کے انفرادی رنگ و آہنگ کی غمازی کرتی ہیں۔

خالد بشیر کا دوسرا شعری مجموعہ ''خواب پارہ'' ان کی پچیس سال سے زائد کی زندگی کا ثمرہ ہے۔ زندگی کے ان پچیس برسوں میں شاعر جن کٹھنائیوں، مصیبتوں، ناکامیوں اور مشکلات سے روبرو ہوا ہے اس مجموعے میں ان کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ زندگی کی تلخیوں کے علاوہ اس

میں گردونواح کی بے بسی اور بے کسی کے ماحول کی منہ بولتی تصویریں بھی نظر آتی ہیں۔

خالد بشیر کی شاعری جہاں ان کی عصری آگہی اور جہاں بینی کی عکاس وترجمان ہے وہاں وہ ان کے گہرے اور مسلسل مشاہدات اور تجربات کی آئینہ دار ہے۔ انہوں نے غزلوں اور نظموں کے علاوہ حمد ونعت اور مناجات وغیرہ لکھ کر اس بات کو پایۂ ثبوت تک پہنچایا ہے کہ انہیں مذہب سے بھی گہرا شغف ہے، وہ خدا اور اس کے رسولؐ سے والہانہ عقیدت رکھتے ہیں اور ان کا دل عشق الٰہی اور عشق رسولؐ سے سرشار ہے۔ ان کے دوسرے مجموعۂ کلام ''خواب پارہ'' کا آغاز ہی اس خوبصورت حمد سے ہوا ہے۔

وہ پیاس دیتا ہے تو اس کے بعد پانی بھی
اسی یقین پر ہے میری خوش گمانی بھی
اُسی کے حکم سے چلتی ہے جنگلوں میں ہوا
وہی جو دیتا ہے دریاؤں کو روانی بھی
یہ رنگ سارے اسی کے زمیں پر بکھرے ہیں
ہرا بھی، لال بھی، دھانی بھی، ارغوانی بھی
اسی کے نام سے کھلتے ہیں باب ذہنوں کے
اسی کی بخششیں الفاظ بھی، معانی بھی

خالد بشیر کے شعری مجموعے ''صدائے نیم شب'' اور ''خواب پارہ'' کے مطالعے کے بعد یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ جموں وکشمیر میں خالد بشیر کی شعری خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ ان کے کلام میں بے پناہ تازگی ہے۔ بقول فرید پربتی۔

''خالد بشیر نئے فکر واحساس کے شاعر ہیں۔ ان کے لہجے، زبان اور طرزِ فکر میں زبردست تازہ کاری موجود ہے۔ ان کا لہجہ، زبان اور اسلوب اپنا ہے اور پہاڑی ندی کی طرح خالص اُنہوں نے عصری

حقائق کو ذات کے حوالے سے منفرد پیرائے میں بیان کیا ہے"۔ ۲۲

انہوں نے اپنے خیالات اور جذبات کے اظہار کے لئے عمومی لب ولہجے سے ہٹ کر ایک ایسا لب ولہجہ اختیار کیا ہے، جو انہیں دوسرے شعراء سے ممتاز بنا دیتا ہے۔ ان کی شاعری کے کئی پہلو اور جہات ہیں۔ ان کی شاعری میں بیان کی سچائی، زبان کی سادگی و شیرینی، جذبے کا خلوص، چونکا دینے والا اسلوب، معصوم سرگوشی کا انداز، اثر آفرینی، درد و کسک، شائستہ اور نکھرا ہوا شعور اور روایت اور جدت کا ایک حسین امتزاج ہے۔ اردو ادب میں بالعموم اور ریاست کے حوالے سے بالخصوص ان کی شاعرانہ خدمات قابل ذکر ہیں۔ جموں و کشمیر کے حوالے سے جب بھی کوئی شعر وادب کی تاریخ تحریر کرے گا، اس کا مصنف خالد بشیر کی ادبی خدمات کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ خالد بشیر نے اپنی تخلیقات کے ذریعے اُردو ادب کے سرمائے میں جو اضافہ کیا ہے، اس کے لئے انہیں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

ترنّم ریاض:۔ ترنّم ریاض کی پیدائش ۹ اگست ۱۹۶۳ء کو سری نگر میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام چودھری محمد اختر تھا۔ کشمیر میں پیدائش ہونے کے سبب ان کی مادری زبان بھی کشمیری ہے۔ اِس کے علاوہ اُردو، انگریزی، پنجابی اور پٹھانی پر بھی فوقیت حاصل ہے۔ ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۷۵ء میں ہوا، تب سے لے کر آج تک وہ مسلسل لکھ رہی ہیں۔ وہ نہ صرف ایک شاعرہ ہیں بلکہ ایک اچھی افسانہ نگار، محقق، اور نقاد بھی ہیں۔ ان کے شریکِ حیات پروفیسر ریاض پنجابی سابق وائس چانسلر کشمیر یونیورسٹی، ایک باکمال عالم، مفکر اور افسانہ نگار ہیں، جن کے افسانے وقتاً فوقتاً ماہنامہ شب خون (الہ آباد) سے شائع ہوتے رہے ہیں۔ ترنّم ریاض نے جموں وکشمیر میں اکیسوی صدی میں اُردو فکشن کے ساتھ ساتھ اُردو شاعری کو بھی فروغ بخشا ہے۔

ترنّم ریاض کی شاعری کو پڑھنے سے ایسا لگتا ہے کہ جیسے وہ ایک معتبر اور سنجیدہ دل کی آواز ہیں۔ اپنے دل کے اندر زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں جس میں نہ تصنع اور نہ اکہرا پن پایا جاتا ہے۔ بلکہ نسوانی پہلوؤں کی عکاسی کرتی ہیں۔ انسانی جذبات و

احساسات کو ترنم ریاض نے غزلوں اور نظموں میں لطافت اور شگفتگی کے ساتھ برتا ہے۔ زندگی کی تمام پریشانیوں کو دیکھتی اور محسوس بھی کرتی ہیں اور اپنے جذبات و احساسات کو تمام طریقوں سے جانچتی بھی ہیں۔

ترنم ریاض نے غزلوں کے ساتھ ساتھ نظموں میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی چند نظمیں ''گھر''، ''منظر''، ''بچپن''، ''سمی الدّعا''، اور ''وجود'' ہیں، جن میں وہ بڑے خوبصورت انداز سے اپنے خیالات قلم بند کرتی ہیں۔

ترنم ریاض کی نظم 'گھر' میں جس طرح کا انداز اپنایا گیا ہے اس سے گھر کی پوری حقیقت ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ اس نظم میں گھر کے آنگن کا پورا ماحول آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔ ہر مرد و زن کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے گھر میں خوشی اور پیار و محبت سے زندگی بسر کرے۔ ترنم کا گھر اس لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے جس میں ایک طرف بلبلیں نغمہ خواں ہیں تو دوسری طرف پھولوں کی کیاریاں شادابی، شبنم کے قطرے ٹھنڈک اور ذہنی آسودگی کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ گویا شاعرہ نے جس گھر کا نقشہ تیار کیا ہے وہ عملی صورت میں اپنے تمام جمالیاتی پیکر لئے ایک حسین منظر کی صورت اس کے سامنے ہے جس میں رہتے ہوئے وہ کافی مطمئن نظر آتی ہیں۔

جہاں تک ترنم ریاض نے عصری حالات میں منہدم ہوتی انسانی اقدار اور سفا کانہ قوتوں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے تو وہیں فطری طاقتوں کے آگے انسان کی بے بسی کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ اسے اپنی زندگی کی یادیں تڑپانے لگتی ہیں۔ ترنم نے ایک نظم ''بچپن'' میں سحر جگایا ہے۔ نظم کا بند ملاحظہ ہو۔

چلا آ!

اے میرے بچپن

آ جا لوٹ کر

باہوں میں میرے

لے کر وہ میری گڑیا

ہر انسان کی زندگی کے ساتھ بچپن کی کچھ یادیں ہمیشہ کے لئے جڑی ہوتی ہیں جنھیں وہ بار بار یاد کر کے اپنے بیتے ہوئے لمحوں کو یاد کرتا ہے۔ یہ انسانی زندگی کا وہ اسٹیج ہوتا ہے جسے بے فکری اور مستانگی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ انسان اگر لاکھ کوشش کرے وہ اپنے بچپن کے گزرے ہوئے دنوں کو بھلائے نہیں بھول سکتا۔ ترنم ریاض کی نظم بچپن ان کے لئے ایک تلخ یاد بن کر رہ گئی ہے۔ وہ بچپن کی طرف لوٹ جانے کی حسرت کرتی ہیں مگر زندگی کے کچھ ایسے اصول بھی ہیں کہ اگر کچھ چیزیں ایک بار چلی جائیں تو وہ لوٹ کر واپس نہیں آتیں چاہے اس کے لئے انسان لاکھ کوشش ہی کیوں نہ کرے۔ انسان دنیا میں تمناؤں اور آرزوؤں کے سہارے زندگی گذارتا ہے۔ وہ اپنی آرزوؤں کی تکمیل کی خاطر ہر ممکن کوشش کرتا ہے مگر یہ ضروری نہیں کہ ہر انسان کی آرزوئیں پوری ہوں۔ کافی حد تک انسان کی اس جبلی خواہش میں اس کی امیدوں کا بھی دخل ضروری ہوتا ہے جس کی بنا پر وہ ہر وقت حرکت میں رہتا ہے۔ ترنم ریاض کا معاملہ بھی کچھ اسی طرح کا ہے۔ کبھی وہ ماضی کی حسین وادیوں میں کھونا چاہتی ہیں تاکہ پل بھر کے لئے سکون حاصل کر سکیں۔ اس سلسلے میں ان کی نظم ''منظر'' کے چند بند ملاحظہ ہوں کیجیے۔

نرم کمبل میں سمٹی

میں لیٹی رہوں

شب کا اک پہر

بند پلکوں پہ منظر کو دیکھا کروں

ترنم ریاض کی شاعری میں عورت کی زندگی کے کئی مسائل نظر آتے ہیں۔ وہ عورت ذات کی ہر وقت نمائندگی کرتی نظر آتی ہیں انھیں عورتوں کی عظمت اور خوبیوں کا احساس ہے۔

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ترنم ریاض نے جو بھی شاعری کی۔ اُس میں ایک

عورت کے دردو کرب اور اضطراب کی شاعری کا عکس ملتا ہے۔ ان کی لکھی گئی اکثر غزلوں میں مایوس کُن حالات کی عکاسی ملتی ہے اُن کی غزل کا ایک شعر دیکھئے۔

روح سے ٹپکے لہو آنکھ سے پانی برسے
میں نے سوچا ہی نہ تھا جاتے ہیں بچے گھر سے

شبنم عشائی:۔ موجودہ دور میں ریاست جموں وکشمیر کی نمائندہ شاعرہ میں شبنم عشائی کا شمار بھی ہوتا ہے۔ شبنم عشائی کی پیدائش کشمیر کے ایک قصبہ تاپر پٹن میں ایک جاگیردارانہ گھرانے میں ۱۲اپریل ۱۹۶۲ء میں ہوئی۔ شبنم عشائی بچپن سے ہی کافی ذہین تھیں آس پاس کے ماحول کے ساتھ ساتھ اپنے اردِ گرد کے ماحول پر نظر دوڑائی تو پتہ چلا کہ زندگی تو کچھ بھی نہیں ہے۔ اور سماج میں عورت ذات کو کس مقام پے رکھا گیا ہے اس موضوع کے حوالے سے اُنھوں نے ''بیگانگی کے وجودی نظریہ'' پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اُن کا اوّلین شعری مجموعہ ''اکیلی'' جو ۱۹۹۹ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اور ۲۰۰۰ء میں اُن کی نظموں کا انتخاب ''میں سوچتی ہوں'' شائع ہوا ۲۰۰۲ء میں ان کی اردو ہندی رسم الخط میں نظمیں ''من مانی'' کے نام سے منظر عام پر آئی۔ اور جنوری ۲۰۰۸ء میں اُن کی نظموں کا ایک اور مجموعہ ''کتھارسس'' کے نام سے شائع ہوا۔ شبنم عشائی کی شاعری میں کافی حد تک عارفہ کی شاعری کے عکس نظر آتے ہیں۔ عورت ذات پر ظلم، اُس کی سسکیاں، دردو کرب کے عالم میں ہو رہے تشدّد کے بارے میں شبنم عشائی نے جس طرح پیش کیا ہے۔ اس طرح کا انداز ریاست کی شاعرات میں بہت کم ملتا ہے۔

شبنم کی شاعری ایک ایسی خاتون کی شاعری ہے جو نسوانی جذبات واحساسات، درد وکرب، اور زندگی کے نشیب وفراز کا گہرا شعور رکھتی ہیں۔ حسن وعشق اور زندگی کے اس سلسلے میں کیا کچھ باقی رہتا ہے اس کا اندازہ کسی کو بھی نہیں ہے اس سانحے کو انھوں نے اپنی نظموں میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے اس سلسلے میں اُن کی یہ نظمیں ملاحظہ کیجئے:۔

آدھی رات

کوئی میری زمین پر اُترتا ہے

روشنیاں بکھرتا ہے

جھلتی دھوپ میں

....

تجھے

دیکھ کے

یوں لگتا ہے

جیسے

چاند اُترا ہو

....

تمہاری

باہوں کے چھوٹے سے حصار میں

مجموعی طور پر شبنم عشائی نے اپنی شاعری کے ذریعے اپنی پرشکوہ لہجے میں کہیں تو مرد معاشرے کے مسائل کو پیش کیا ہے تو کہیں عورت ذات کو شعور اور آگہی کا درس بھی دیتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

پرویز مانوس:۔ نوجوان شعراء میں پرویز مانوس کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ پرویز مانوس کی شاعری میں زیادہ تر رومانی عشق ومحبت اور محبوب جو کہ جیتا جاگتا وجود رکھتا ہے کی بھر پور عکاسی کی گئی ہے۔ یقیناً اس میں پرویز مانوس کی شاعرانہ طبیعت کے مختلف پہلوؤں کا دخل ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں جدید پرستی جس میں سائنس سے وابستگی اور اس کے ذریعے ترقی کے باوجود انسانی قدروں کی پامالی کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان کے خیال میں آج کے دور میں

زیادہ تر توجہ ترقی کی طرف ہے جبکہ زیادہ تر توجہ معاشرے کی تہہ میں چھپے ہوئے مسائل کی طرف ہونی چاہیے۔

لٹتے ارمانوں کا مٹھی میں لیے مال ومتاع
ہم جہاں پھرتے ہیں، بازار لیے پھرتے ہیں

اُن کے اشعار میں معاشرے میں رونما ہونے والے واقعات کے جذباتی تقاضوں پر سماجی تقاضوں کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ یہ احتجاج کہیں نرم لہجہ میں اور کہیں سخت انداز میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ معاشرے میں زندگی بسر کررہے افراد کی مصیبتوں، تکلیفوں اور رنجشوں سے بخوبی واقف ہیں۔ اور اُن کے نفسیاتی پہلوؤں کو بھی اچھی طرح جانتے ہیں۔

بہت غرور پروں پر ہے جس پرندے کو
تم اس کے سامنے اونچی اُڑان رکھ دینا

چاندکو چھونے کی ضد نے بدنام کیا
ہم نے تیرے نقش بنائے شاخوں پر

اقبال فہیم جموں وکشمیر کے موجودہ دور۔ کے ایک اور معروف شاعر ہیں، غزل اور نظم دونوں پر عبور رکھتے ہیں۔ عبدالقیوم ساغر اقبال فہیم کے ہمعصر شاعر ہیں۔ وہ بڑے خوش گو اور خوش فکر شاعر ہیں چند اشعار پیش ہیں۔

کوئی رومی کوئی حجازی ہے
اور کوئی مردِ غازی ہے
تو نے اغیار سے بھی پیار کیا
کیا تیری شانِ دل نوازی ہے

فرید پربتی:۔ فرید پربتی نے بہت کم مدت میں اُردو شاعری میں اعلیٰ مقام پیدا کرلیا

ہے۔اُن کے شعری مجموعے ''آب نسیاں''، ''فرید نامہ'' ۲۰۰۳ء، ''گفتگو چاند سے'' ۲۰۰۵ء، ''انتقاد واصلاح'' ۲۰۰۵ء، ''ہزار امکان'' ۲۰۰۶ء، ''خبرِ تحیر''، ۲۰۰۷ء، ''ہجوم آئینہ'' ۲۰۱۰ء، اور ''ہزار امکاں'' ۲۰۱۱ء، (کلیات) جدید حیثیت اور عصری آگہی کے مظہر ہیں۔

فریدؔ پربتی کی شعری جمالیات کا محور کشمیر سے محبت ہے۔شاعر ایک حساس فرد ہوتا ہے جو سماج کے شاد و ناشاد اور دُکھ درد کو محسوس کر کے ان کا برملا اظہار کرتا ہے بلکہ اپنے عہد کی پوری تاریخ اپنے فن پارے میں سمو دیتا ہے۔فریدؔ پربتی نے بھی لوگوں کی بے چارگی، درماندگی اور خود غرض عناصر کا استحصال، اذیت اور جبر و تشدد کو بڑے قریب سے دیکھا جس کی وجہ سے ان کے ضمیر نے انھیں لب بستہ نہیں رہنے دیا۔انہوں نے ان تمام حالات و کوائف اور بدامنی کی زندگی کی مختلف کیفیتوں کو اپنے تجربے اور مشاہدے کی بھٹی میں تپا کر شعری پیکر میں ڈھال دیا ہے۔ان کی شاعری میں وجودی کا کرب یا اظہارِ ذات کا رشتہ ہی نہیں بلکہ ان کا رشتہ قوم کے مستقبل سے جڑا ہوا دکھائی دیتا ہے۔فریدؔ پربتی کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی نے بڑی متوازن رائے کا اظہار کیا ہے۔

''فریدؔ پربتی ہمارے اُن شاعروں میں ہیں جو شعری روایت سے نہ صرف واقفیت رکھتے ہیں بلکہ وہ ہماری کلاسیکی شاعری اور بوطیقا سے حسب توفیق استفادہ بھی کرتے ہیں۔ان کے ہاں نہ سراسر روایت پرستی ہے اور نہ روایت گذیدگی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ جمالیاتی شعری آگہی کے ساتھ اُنہوں نے اپنی فطرت کے عین مطابق ملک کی عام تہذیبی، روحانی اور انسانی روایات و اقدار کا بھی گہرا عرفان حاصل کیا ہے''۔ ۲۳

فریدؔ پربتی کی شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد پروفیسر محمد نورالدین اس طرح رقمطراز ہیں۔

''ان کی شاعری میں ایک خاص در و بست، جماؤ اور رچاؤ کا احساس

ہوتا ہے۔ جس کے پس پردہ طبیعت کی خداداد موزونیت کے علاوہ برسوں کی مشق و مزاولت اور محنت و ریاضت کارفرما ہے۔ فرید پربتی ایک خوش فکر، خوش گو اور قادرالکلام شاعر ہیں۔ انھیں شاعری کی مختلف اصناف مثلاً غزل، نظم، رباعی، قطعات وغیرہ کی تخلیق میں استادانہ مہارت حاصل ہے"۔ ۲۴

مذکورہ بالا آراء سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ فرید پربتی ایک حساس اور دیدہ ور شاعر تھے۔ اُن کی شاعری اپنے معاصرین کی شاعری سے اپنے شعور و احساس، فکری زاویے، لسانی رویے، سماجی سیاق اور خارجی پسِ منظر کے حوالے سے ندرت و انفرادیت کی حامل ہے۔ ان کے چیدہ چیدہ اشعار درج ذیل ہیں۔

؎ رونق یہ میرے شہر کی اب لے گیا ہے کون ؟
ایک اک سڑک خموش ہے ایک اک دکان بند

؎ اس درجہ گھٹ گیا ہے مکینوں میں اعتماد
کرتے ہیں شام ہونے سے پہلے مکان بند

؎ اب اسی شہر میں کرتا ہوں طلب جائے اماں
لوگ جس شہر سے جان اپنی بچا کر نکلے

؎ اس درجہ بڑھے نقلِ مکانی کے یہاں شغل
تعمیر کہیں پر بھی مکاں کر نہیں پائے

؎ تاریک مناظر کو بدلتا ہوں اکیلا
مرقد کا دیا بن کے میں جلتا ہوں اکیلا

دوش ہوا پہ کاغذِ آتش زدہ ہوں میں
خاشاکِ صبح و شام پہ رقصاں نہ رکھ مجھے

تنہا ہوں چار سمت ہے یلغارِ تیرگی
میں اِک چراغ ہوں تہہِ داماں نہ رکھ مجھے

گھر میں بیٹھا سوچ رہا تھا مجھ سا دکھی ہے گھر میں کون
چھت پر چڑھ کر میں نے دیکھا لگی ہوئی گھر گھر آگ

پہلے پوچھا جو نہیں تھا وہی سب پوچھتی ہے
زندگی رات سے جینے کا سبب پوچھتی ہے

قدم قدم پہ بکھرتا ہوں ٹوٹ جاتا ہوں
نہ راس آتا ہے مجھ کو ذرا یہ دور نیا

اُداسیوں کے پرندے مُنڈیر پر رکھ کر
خموشیوں کے شجر صحن میں اڑا کے گیا

تجھ کو کیا دوں گا نہ خوشبو ہے نہ شبنم ہے نہ رنگ
میرے دامن میں بجز موجِ ہوا کچھ بھی نہیں

فرید پربتی نے جہاں غزل میں مہارت حاصل کی وہیں رباعی کے فن میں بھی کمال دیکھایا ہے بقول یوسف ٹینگ۔

''رباعی اُن کے مزاج کو راس آتی ہے اور وہ اس سنگ صفت صنف کو پگھلانے اور اسے اپنی پسند کے مطابق ڈھالنے کی صلاحیت رکھتے ہیں''۔ ۲۵

مجموعی طور پر یہ کہ ادب کی جن برگزیدہ شخصیتوں نے ان کے فکر وفن کو سراہا ہے، ان میں پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی، پروفیسر عتیق اللہ، پروفیسر حامدی کاشمیری، پروفیسر ابنِ کنول، پروفیسر وہاب اشرفی، پروفیسر زماں آزردہ، پور فیسر جاوید قدوس، جیسے نامور ادیب اور نقاد شامل ہیں۔ پروفیسر شمیم حنفی، فرید پربتی کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"فرید پربتی کے اندر نظم ونثر کی صلاحیتیں غیر معمولی ہیں۔ یہ بات بھی قابلِ قدر ہے کہ فرید پربتی مشکل اصناف اور علمی وادبی مسائل سے گہرا شغف رکھتے ہیں"۔ [۲۶]

فرید پربتی کی رباعیات کے مجموعے "فرید نامہ" پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے ابرار رحمانی رقم طراز ہیں۔

"ویسے تو فرید پربتی بنیادی طور پر غزلوں پر بھی دسترس رکھتے ہیں اور "اثبات" کی غزلوں سے ان کی شناخت قائم ہوئی لیکن میری نظر میں ان کا اصل میدان رباعی ہے" [۲۶]

فرید پربتی کی رباعیات کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

برباد ہوا صحنِ چمن، رقص میں ہوں
ویرانہ بنا اپنا وطن، رقص میں ہوں
باقی نہیں ارتباط روح اور تن میں
رہ بر ہے بشکلِ راہ زن، رقص میں ہوں

بڑھتا ہے اب احساسِ زیاں روز بروز
جلتا ہے اِک آسودہ مکاں روز بروز

بدلا ہے چمن، بدلا ہے گلچیں کا مزاج
خوابوں کا یاں اُڑتا ہے دھواں روز بروز

خود کو میں رکھوں اوروں کے بس میں کب تک
غیروں کو بناؤ ہم نفس کب تک
جس میں کوئی کھڑکی ہے نہ دروازہ کوئی
میں قید رہوں اُس اک قفس میں کب تک

نا دیدہ مقامات دیکھاتا ہے کوئی
ہوں اصل میں ہی، یہی بتاتا ہے کوئی
تُو تُو کا پڑھا میں نے وظیفہ اک عمر
میں میں کا سبق مجھے پڑھاتا ہے کوئی

فریدؔ پربتی کی شاعری کے اس مختصر سے مطالعہ سے اتنی بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ حقائق زندگی سے پوری طرح واقف تھے۔ حقیقت نگاری، زبان کی سادگی، وسیع النظر، بلند خیالی، فراخ دلی ان کی اہم خصوصیات ہیں۔ ان کے کلام میں اعلیٰ انسانی قدروں کی حلاوت موجود ہے۔ وہ شاعری میں فنی اور جمالیاتی اقدار کی قدر و قیمت سے نہ صرف یہ کہ کماحقہ واقف ہیں بلکہ ان اوصاف سے کبھی سمجھوتہ نہیں کرتے۔

پریمیؔ رومانی:۔ کا شمار جموں وکشمیر کے جدید شعراء میں ہوتا ہے، آپ کا تعلق کے ایک علمی وادبی خاندان سے ہے۔ اُن کا مجموعہ ''سنگِ میل'' کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ ان کا اصل میدان اگر چہ ادبی تنقید ہے اس کے باوجود پچھلے چند سالوں سے اُنہوں نے کافی منفرد غزلیں اور نظمیں پیش کی ہیں۔ اُن کی غزلوں میں منفرد لفظیات اور زبردست تنوع پایا جاتا ہے اور ان کی نظموں میں فنی رچاؤ اور بے پناہ تخلیقیت موجود ہے۔ ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

آئینہ دیکھتا ہے مجھے آئینے کو میں
یوں عکس عکس ٹوٹ گیا ہوں غلط نہیں

پریمی ہر اک رات کے سر پہ ہے اک رات
سورج ہے وہ سر اب کہ جس کا نہیں زوال

میں رہا ہوں عمر بھر خود سے جُدا
مجھ سے سایہ بھی مرا بچ کر چلا
سائے کو میرے دیکھ کے یہ مان لیں گے آپ
میں آپ اپنے قد سے بڑا ہوں غلط نہیں

تنہائیوں کے گھر میں رہا ہوں تمام عمر
میں کس لئے جہاں میں جیا ہوں تمام عمر

مذکورہ شعراء کے علاوہ جموں وکشمیر کی شعری فضا کئی منفرد ناموں سے معمور ہے جن کے یہاں تازہ کاری اور بھرپور امکانات موجود ہیں۔ جن میں شاہباز راجوروی، جاوید آذر، لیاقت جعفری، شوکت شفائی، حیات عامر، رفیق ہمراز، سجاد حسین، فدا راجوروی، سجاد پونچھی، جان محمد آزاد وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ مجموعی طور پر ریاست میں اکیسوی صدی میں اُردو شاعری کے اس جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ آج کی تاریخ میں جموں وکشمیر میں اُردو شعراء کی ایک بڑی تعداد ایسی ہے۔ جو اس وقت اپنا ادبی سفر جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ان شعراء کی شاعری کا دائرہ جدید ٹیکنالوجی اور سائنسی علوم وفنون کی بدولت کافی وسیع ہے اور وہ پوری محنت ولگن سے اپنے تخلیقی سفر میں مصروف ہیں۔ آئے دن کسی نہ کسی کا شعری مجموعہ منظرعام پر آتا رہتا ہے جس سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ریاست جموں وکشمیر میں اُردو شاعری کا مستقبل روشن اور تابناک ہے۔

حواشی

۱۔ برج کشن بے خبر پنڈت، بہار گلشن کشمیر، انڈین پریس الہ آباد ۱۹۳۲ء، ص ۲۸۴۔

۲۔ عبدالقادر سروری پروفیسر، کشمیر میں اردو (حصہ دوم)، جے کے آفسٹ پرنٹرس دہلی ۱۹۸۴ء، ص ۴۲۔

۳۔ مجید مضمر پروفیسر، مضمون، شیرازہ (حامدی کاشمیری نمبر)، جلد ۴۵، ص ۱۶۶۔

۴۔ مظہر امام پروفیسر، مضمون، شیرازہ (حامدی کاشمیری نمبر)، جلد ۴۵، ص ۳۰۔

۵۔ محی الدین قادری زورؔ پروفیسر، بحوالہ، شیرازہ (حامدی نمبر)، جلد ۴۵، ص ۳۵۔

۶۔ بحوالہ، مظہر امام پروفیسر، مضمون، شیرازہ (حامدی کاشمیری نمبر)، جلد ۴۵، ص ۳۶۔

۷۔ حامدی کاشمیری پروفیسر، شاخ زعفران، ص ۱۳۔

۸۔ مظہر امام پروفیسر، مضمون، شیرازہ (حامدی کاشمیری نمبر)، جلد ۴۵، ص ۴۱۔

۹۔ بلراج کومل، تبصرہ، ص ۴۔

۱۰۔ مظہر امام پروفیسر، مضمون، شیرازہ (حامدی کاشمیری نمبر)، ص ۳۹۔

۱۱۔ برج پریمی ڈاکٹر، جموں وکشمیر میں اردو ادب کی نشو ونما، ص ۱۹۸۔

۱۲۔ شمس الرحمن فاروقی، بحوالہ، رفیق راز ''انہار'' ۱۹۹۸ء فلیپ پر درج رائے۔

۱۳۔ حامدی کاشمیری پروفیسر، بحوالہ، رفیق راز ''انہار'' ۱۹۹۸ء کے فیلپ پر رائے۔

۱۴۔ فاروق نازکی، تعارف مشمولہ ''شام سے پہلے''، ص ۶-۵

۱۵۔ بحوالہ، سید عقیل رضوی، معاصر اُردو غزل، ناشر، معیار پبلی کیشنز دہلی ۲۰۰۶ء، ص ۵۶

۱۶۔ ایضاً

۱۷۔ جاوید انور، مضمون، احمد شناس کی غزلیں، مطبوعہ ''تحریک ادب''، ناشر، جاوید نور وارانسی ۲۰۱۱ء، ص ۳۸۰۔

۱۸۔ محمد یوسف ٹینگ، پیش آشکار، ص ۹

۱۹۔ نصرت آرا چودھری، ہتھیلی کا چاند، ۲۰۰۴ء (پیش لفظ)۔

۲۰۔ فرید پربتی، مضمون، مطبوعہ، ترسیل، شمارہ نمبر ۹، ۲۰۱۱ء، ص ۱۳۷۔

۲۱۔ یہ اقتباس پورن سنگھ ہنر کے غیر مطبوعہ مضمون سے ماخوذ ہے۔

۲۲۔ فرید پربتی، مضمون، مطبوعہ، ترسیل، شمارہ نمبر ۹، ۲۰۱۱ء، ص ۱۳۰۔

۲۳۔ قاضی عبید الرحمن ہاشمی پروفیسر، مضمون، شیرازہ، فرید پربتی نمبر جلد ۴۹، ص ۱۲۔

۲۴۔ محمد نورالدین پروفیسر، مضمون، شیرازہ، فرید پربتی نمبر جلد ۴۹، ص ۲۷۔

۲۵۔ بحوالہ جاوید احمد ڈار، مضمون، شیرازہ، فرید پربتی نمبر جلد ۴۹، ص ۹۴۔

۲۶۔ بحوالہ محمد نورالدین پروفیسر، مضمون، شیرازہ، فرید پربتی نمبر ۴۹، ص ۲۷۔

جموں وکشمیر میں اُردو تحقیق وتنقید

۲۰۰۰ء تا ۲۰۱۰ء

اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں جموں وکشمیر میں اُردو تحقیق وتنقید کی صورتِ حال، گذشتہ دوتین دہائیوں سے کہیں زیادہ زرخیز اور بہتر ہے۔آج اکیسویں صدی میں جموں وکشمیر میں تحقیقی وتنقیدی فن پارے پیش کرنے والوں کی تعداد کئی زیادہ بڑھ گئی ہے۔اگرچہ موجودہ محقق اور نقاد میں چند ایک ہی ایسے ہیں جن کو جموں وکشمیر کے اساتذۂ تنقید وتحقیق مثلاً اکبر حیدری، طالب کشمیری، حامدی کاشمیری، برج پریمی، ظہور الدین، محمد یوسف ٹینگ اور قدوس جاوید وغیرہ کی صف میں کھڑا کیا جاسکتا ہے لیکن ان میں بیشتر تحقیق وتنقید کے بہترین نمونے پیش کررہے ہیں۔ چنانچہ میں نے اکیسویں صدی میں ریاست جموں وکشمیر میں اُردو محققین اور ناقدین کی خدمات کا جائزہ کہیں تفصیل سے تو کہیں اختصار کے ساتھ پیش کرنے کی سعی کی ہے۔

پریمی رومانی:۔تنقید وتحقیق کے میدان میں پریمی رومانی نے اُردو ادب کو کئی معیاری تصانیف دی ہیں جن میں ''جدید اُردو شاعری چند مطالعے''،''اوراق''،''تحریر وتقریر''،''انتخابِ مضامین''، ''ردِّ عمل''،''تاثرات''،''پیش رفت'' وغیرہ اہم ہیں۔

''ردِ عمل'' میں پریمی رومانی نے اُردو کے نامور جدید شعراء جن سے وہ کافی متاثر ہوئے ہیں، پر خامہ فرسائی کی ہے۔ ان شعراء میں اختر الایمان، خلیل الرحمٰن اعظمی، بلراج کومل، کرشن موہن، مخمور سعیدی، وزیر آغا، شہریار، مظہر امام، ساقی فاروقی، زبیر رضوی، بمل کرشن اشک، حامدی کاشمیری، محمد علوی اور ندا فاضلی وغیرہ شامل ہیں۔ ان مضامین میں پریمی نے شاعروں کا مختصر خاکہ کھینچا ہے اور پھر ان کی شاعری پر اپنی رائے ظاہر کی ہے۔ ساتھ ہی مضامین کو شاعروں کے نمونۂ کلام سے بھی مرصع کیا ہے۔ ان میں سے زیادہ تر شاعر علائم اور استعاروں سے کام لیتے ہیں مگر ان کے یہاں ''ترسیل کا المیہ'' کہیں نظر نہیں آتا۔

''تاثرات'' میں پریمی رومانی نے ایک طرف سیماب اکبر آبادی، حفیظ جالندھری، قتیل شفائی اور عنوان چشتی جیسے چند شاعروں کی شاعری کا جائزہ لیا ہے اور دوسری طرف منشی پریم چند اور کرشن چندر جیسے مقبول فکشن نگاروں پر بھی قلم اُٹھایا ہے۔ بقول پریمی۔

> ''سیماب سامراج کے سفاک رویہ سے دل برداشتہ تھے اور فرنگی شاطروں کی فریب کاریوں سے آشنا تھے۔ اُن کا دل بھی آزادیٔ وطن کے لیے بے چین تھا۔ اتنا ہی نہیں وہ اہل وطن کو آزادی کی جدوجہد کے لیے آمادۂ پیکار دیکھنا چاہتے ہیں اور ان کے ارادوں میں بغاوت کے شعلوں کی آگ دیکھنا چاہتے ہیں۔'' [1]

''پیش رفت'' (۲۰۰۲ء) میں مضامین کی بوقلمونی نظر آتی ہے۔ جہاں ایک جانب اقبالؔ، ٹیگور، جگن ناتھ آزاد اور مظہر امام پر تنقیدی مضامین لکھے گئے ہیں تو دوسری طرف جموں و کشمیر کے ادیبوں میں پریم ناتھ پردیسی، دینا ناتھ مستؔ کاشمیری، شام لال ایمہ، رساؔ جاودانی، میر غلام رسول نازکیؔ، موتی لال ساقیؔ، مرغوب بانہالیؔ، بنسی نردوش، سائل کاشمیری اور کشوری منچندہ پر بھی خامہ فرسائی کی گئی ہے۔ ان میں سے چند ایک ادیب کشمیری زبان و ادب کے جانے مانے قلم کار ہیں۔ ان مضامین کے علاوہ گیت ہماری تہذیب کے آئینہ دار، ''اُردو داستان

اور ہندوستانی داستانیں'، اور اُردو کے تئیں ریاست کے ادبی اداروں کا رول بھی شامل اشاعت ہیں جو پریمی رومانی کی تحقیقی صلاحیت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ جمہوری فکر اور ٹیگور کی شاعری، میں ٹیگور کے نظریے کو پیش کیا گیا ہے۔

حال ہی میں پریمی رومانی کی ایک اور کتاب بعنوان ''میزان'' منصہ شہود پر جلوہ گر ہوئی ہے۔ اس میں چھتیس تصانیف پر ڈاکٹر رومانی کے تبصرے شامل ہیں۔ ان تصانیف میں ناول، افسانے، ڈرامے، تحقیق وتنقید اور اقبالیات سبھی کچھ شامل ہیں۔ تبصرے کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں انتقادی عنصر نمایاں ہے اور پریمی رومانی نے تصانیف کا بغور مطالعہ کر کے انہیں قلم بند کیا ہے۔ البتہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہاں بھی پریمی رومانی نے زیادہ تر جموں وکشمیر سے وابستہ ادیبوں کو ترجیح دی ہے۔ پریمی رومانی کے بارے میں پروفیسر مسعود حسین خان فرماتے ہیں۔

> ''پریمی رومانی نے تنقید کرتے وقت نہایت عزم اور احتیاط سے کام لیا ہے۔ کیونکہ ان کا ذوقِ شعری بھی نفیس ہے۔ اس لیے کمالِ فن کی اچھی پرکھ بھی کی ہے۔ جہاں فن کی کسوٹی پر کسی نظم یا شاعر کو پورا نہیں پایا، وہاں بے باکی سے انگلی بھی دھری ہے۔''[۲]

پریمی رومانی نے نثری اور شعری ہر نوع کے موضوعات پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ وہ کہیں تفصیلی تجزیہ کرتے ہیں تو کہیں اختصار سے کام لیتے ہیں۔ لیکن جامعیت کے ساتھ اپنی بات کہہ جاتے ہیں۔ ہر چرن چاولہ کے افسانوں کے بارے میں انہوں نے لکھا ہے۔

> ''انسان کے مسائل اور ان کا درد وکرب اور اُن کے مصائب ومشکلات کا چاولہ کو بخوبی اندازہ ہے۔ ان کی کہانی آج کل کے ٹوٹے اور بکھرے ہوئے انسان کی کہانی معلوم ہوتی ہے۔ اُن کا مشاہدہ تیز اور مطالعہ وسیع ہے۔ چاولہ سنی سنائی باتوں پر یقین نہیں کرتے بلکہ معاملہ کی تہہ تک پہنچنے کے قائل ہیں۔ ان کے کردار چلتے پھرتے کردار ہیں۔ یہ کردار ایسے سچے

اور کھرے ہیں کہ حقیقت پسندی کا دامن نہیں چھوڑتے۔'' ۳

اسی طرح ڈاکٹر ظہور الدین کے افسانوں کے مجموعہ'' تلافی'' دیپک بدکی کے افسانوی مجموعے'' ادھورے چہرے'' مشتاق احمد وانی کے افسانوں کے مجموعے'' ہزاروں غم'' اور زنفر کھوکھر کے افسانوں کے مجموعے'' کانچ کی سلاخ'' اور ایسے ہی دیگر افسانہ نگاروں کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے انہوں نے اجمال سے ضرور کام لیا ہے لیکن پتہ کی بات کہہ جاتے ہیں۔ زنفر کھوکھر کے افسانوں کے بارے میں انہوں نے لکھا ہے۔

'' زنفر کا اسلوب صاف ستھرا اور نکھرا ہوا ہے۔ اس میں کوئی پیچ وخم نہیں بلکہ وہ براہ راست اپنی بات دوسروں تک پہنچانے کی قائل ہیں۔ ان کی زبان میں فارسیت کا غلبہ نہیں، انہوں نے آسان اور خوشنما الفاظ اور تراکیب کا سہارا لے کر اپنے افسانوں میں رنگ آمیزی کی ہے۔'' ۴

پریمی رومانی کسی موضوع، مصنف یا کتاب وغیرہ پر گفتگو کرتے ہوئے اپنی رائے کو لاتے نہیں بلکہ موضوع کا اس عمدگی سے تجزیہ کرتے ہیں کہ قاری اپنی رائے آپ قائم کر لیتا ہے یا ناقد کا ہم آواز ہو جاتا ہے۔

پریمی رومانی نے کشمیر کے ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں خصوصیت کے ساتھ لکھا ہے۔ ایسا ضروری بھی تھا کیوں کہ کشمیر کے بعض قلم کار ایسے ہیں جو ملک کے دیگر حصوں میں کم متعارف ہیں۔ پریمی نے ان قلم کاروں کے بارے میں تحریر کرتے ہوئے ایک اہم ادبی ذمہ داری کی تکمیل کی ہے۔ آنند سروپ انجم کے بارے میں یہ اقتباس اہم ہے۔

'' انجم کی شاعری میں نئے اور تازہ فکری لہجے کے ساتھ ساتھ کلاسیکی شاعری کا رچاؤ ملتا ہے۔ ان کے خیالات نرم، ملائم اور نازک ہیں۔ وہ جچے تلے انداز میں بات کو واضح کرنے کے قائل ہیں۔'' ۵

اقبالؔ پر پریمی رومانی نے'' اقبال اور جدید اُردو شاعری'' جیسی وقیع اور بھرپور کتا

ب لکھی۔ اپنے تبصروں کے مجموعہ ''میزان'' میں اقبالیات سے متعلق چار کتابوں ''اقبال اور مشاہیر کشمیر''، ''پیامِ اقبال''، ''اقبالیاتِ آزاد''۔ایک جائزہ'' اور ''مفتاح اقبال'' پر اُن کے تبصرے ہیں جو محنت سے تسوید کیے گئے ہیں اور اقبالیات سے ان کے شغف اور ایک نوع کی وابستگی کی آئینہ داری کرتے ہیں۔ پریمی کی یہ کتاب اقبالیات میں اپنے طور پر اضافہ ہے۔ انہوں نے اقبال کے فکروفن کے کئی گوشوں کو نمایاں کیا ہے۔انہوں نے اقبال کے افکار کا گہرائی سے جائزہ لیا ہے۔

ڈاکٹر پریمی رومانی کا قلم خاصا سنبھلا ہوا ہے، پوری توجہ اور احتیاط کے ساتھ اپنی بات کہتے ہیں۔ مسعود حسین خان صاحب نے پریمی کی تنقیدات کے مطالعہ کے بعد نہایت جچی تلی رائے یوں دی ہے۔

> ''پریمی نے تنقید کرتے وقت نہایت عزم واحتیاط سے کام لیا ہے کیوں کہ اُن کا ذوقِ شعری بھی نفیس ہے اس لیے کمالِ فن کی اچھی پرکھ کی ہے۔ جہاں فن کی کسوٹی پر کسی نظم یا شاعر کو پورا نہیں پایا، وہاں بے باکی سے انگلی بھی دھری ہے۔''[۶]

پریمی رومانی کا طرزِ تحریر دلکش ہے وہ سادہ اور صاف زبان استعمال کرتے ہیں۔ بعضوں کی طرح بات چبا کر نہیں کہتے اور نہ لفاظی کرتے ہوئے ظاہری طور پر متاثر کرتے ہیں لیکن معنویت سے ان کی تحریریں خالی نہیں ہوتی ہیں۔ پریمی کی تنقید متعلقہ فنکار کے فن کی تفہیم میں معاونت کرتی ہیں۔ موضوعات کے انتخاب، اُن کے تعلق سے اپنے رویہ اور طرزِ تحریر کی اپنائیت اور دلکشی کے باعث پریمی کی تحریریں پڑھی جاتی ہیں۔ان کا ادبی سفر یقین ہے اسی آن بان سے جاری رہے گا اور نئی نسل کے اچھے اور سچے ناقدین میں ان کی جگہ ممتاز ہوگی۔

ڈاکٹر پریمی رومانی کے تحقیقی وتنقیدی مضامین کا تازہ ترین مجموعہ ''فکرونظر'' کے نام سے ۲۰۱۲ء میں منظرِ عام پر آیا ہے۔اس مجموعے میں مستند شاعروں اور ادیبوں کے حوالے سے

۱۲ تحقیقی وتنقیدی مضامین کے علاوہ چھ شاعروں کے شعری مجموعوں پر تبصرے شامل ہیں۔ فکر ونظر میں شامل مضامین کے بارے میں ڈاکٹر پریمی رومانی نے کتاب کے آغاز میں ''میری بات'' کے عنوان سے اپنی تحریروں کی معنویت کی وضاحت کرتے ہوئے خود لکھا ہے۔

''فکر ونظر'' میرے تحقیقی وتنقیدی مقالات کا مجموعہ ہے۔ اس میں شامل مقالات اُردو ادب کی مختلف جہات کا احاطہ کرتے ہیں۔ یہ مقالات گرچہ مختلف اوقات میں لکھے گئے ہیں۔ لیکن ان میں تسلسل قائم رکھنے کی حتی الامکان کوشش کی گئی ہے۔'' ۷

اگر دیکھا جائے تو فکر ونظر میں شامل پریمی رومانی کے بعض مضامین ان کی تنقیدی بصیرت مندی کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ خاص طور پر فیض احمد فیض، مظہر امام، صوفی تبسم اور عثمان جوہری کی شاعری کے بارے میں ان کے تنقیدی خیالات اپنا ایک معیار رکھتے ہیں اسی طرح ابوالکلام آزاد، علامہ اقبال اور سعادت حسن منٹو پر ان کے مضامین تحقیقی عناصر کے بھی حامل ہیں۔ بحیثیت مجموعی ڈاکٹر پریمی رومانی ایک ایسے محقق اور نقاد ہیں جن کی تحریریں جموں وکشمیر میں اُردو تحقیق وتنقید کی موجودہ صورتِ حال کو روشن رکھنے کا فریضہ انجام دے رہی ہیں۔

پروفیسر قدوس جاوید:۔ اردو تنقید کی عصری دنیا میں مابعد جدید ادب کے بڑے نقاد جن کا اصل نام محمد قدوس المروف قدوس جاوید کی پیدائش ۱۹۴۷ء کو رانچی میں ہوئی۔ ایک انٹرویو میں بتاتے ہیں:

''تقسیم کے بعد میرے والد موجود جھارکھنڈ کے شہر رانچی میں سکونت پذیر ہو گئے۔ میری پیدائش ریکارڈ کے مطابق سندی اعتبار سے ۲۷ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو ہوئی۔ یہیں میری تعلیم وتربیت بھی ہوئی۔'' ۸

آپ کے والد سیاسی اعتبار سے کانگریس پارٹی کے معروف لیڈر تھے۔ آپ چھ بھائی اور چار بہنیں ہیں۔ بڑے بھائی شاید احمد شعیب Anthropology کے پروفیسر رہے

اور ساتھ ہی اردو ادب کو اپنے شعری مجموعہ ''لے سانس بھی آہستہ'' سے ہمکنار کیا۔ پروفیسر شعیب ایک اچھے کامیاب شاعر، اردو، فارسی، انگریزی کے علاوہ علم بشریات اور سماجیات سے فہم وعلم رکھتے تھے۔ پروفیسر قدوس جاوید کو گھر کے علمی وادبی ماحول، دوستوں اور اساتذہ کی نگرانی نے ان کے اندر تحقیقی اور تنقیدی شعور پیدا کیا۔ ان کی ادبی خدمات اور ادبی ذوق وشوق سے عیاں ہوتا ہے کہ ابتداء سے ہی صحافت کے ساتھ ساتھ تحقیق وتنقید میں دلچسپی تھی جوان کی شہرت کا سبب بنی۔ آپ نے اپنے تنقیدی شعور کا ثبوت ۱۹۸۲ء میں اپنے تنقیدی مضامین کے مجموعہ 'ادب اور سماجیات'' کو شائع کروا کر دیا۔ اس مجموعے کے بعد آپ تقریباً چالیس برس سے اردو زبان و ادب کی خدمت میں مسلسل مصروف ہیں۔ مضامین کا مجموعہ ''ادب اور سماجیات'' ہندوپاک کی یونیورسٹیوں کے نصاب میں بھی شامل ہے جس کے اندراج میں تخلیقی عمل کی سماجیات کی شناخت اور تخلیقی زبان، جدیدیت اور عصری مسائل، جدید افسانے میں حقیقت کا محمل جیسے مضامین شامل ہیں۔ پروفیسر قدوس جاوید نے ۱۹۶۸ء میں بعنوان'' اردو افسانہ آزادی کے بعد'' پی۔ایچ۔ڈی کی۔ ۱۹۷۰ء میں ایک رسالہ ''زبان وادب'' پٹنہ سے نکالتے رہے۔

۱۹۷۸ء میں کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں اسسٹنٹ پروفیسر ہوئے بعد میں شعبہ اردو کے صدر رہے۔ ۲۰۰۸ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ قدوس جاوید کی ادب نوازی اور ادبی دلچسپی کی مثال اس سے بڑھ کر کیا ہوگی کہ ملازمت سے سبکدوشی کے دوسرے سال ہی یو۔جی۔سی کے فیلوشیپ پر ''کشمیر میں اردو نثر کے آغاز'' پر مکمل مقالہ تحریر کیا۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ، شمس الرحمان فاروقی، حامدی کاشمیری، قاضی افضال اور شمیم حنفی کے بعد اردو تنقید میں قد آور نام ہے اگر کوئی ہے تو وہ قدوس جاوید کا ہے۔ پروفیسر قدوس جاوید نے ترقی پسندی کا زمانہ بھی دیکھا اور جدیدیت کے زمانہ کے بعد مابعد جدیدیت کا بھی۔ بلکہ یوں کہنے میں بھی کوئی عار نہیں کہ ان کی تنقید نگاری کا دائرہ کلاسیکل ادب سے لے

کر مابعد جدید ادب تک پھیلا ہوا ہے۔ پٹنہ یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم کے دوران خدا بخش لائبریری میں مطالعہ کے وقت مشہور ادب فہم شخصیات سے ملاقات کا موقع ملتا رہا۔ جن شخصیات کی سرپرستی میں قدوس جاوید مابعد جدید تنقید میں بڑے نقاد کے طور پر سامنے آئے ان میں پروفیسر عسکری، پروفیسر محمد محسن، پروفیسر عبدالمغنی، مشہور ناقد پروفیسر کلیم الدین، قاضی عبدالودود، جمیل مظہری وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں جنھوں نے انہیں ادبی ماحول کی طرف مائل ہی نہیں کیا بلکہ تنقید کی باریکیوں سے واقف بھی کر دیا۔

ان کے ادبی سرمائے کو اگر دیکھا جائے تو انہوں نے اپنا ایک الگ مقام بنانے کی کوشش کی ہے جس میں وہ کامیاب نظر آتے ہیں۔ ان کے پہلے مضامین کے مجموعے کے بعد دوسرا مضامین کا مجموعہ ''تعبیر وتنقید'' ۱۹۹۱ء، تیسرا مضامین کا مجموعہ ''شعر نثر آہنگ'' کے نام سے شائع ہو کر ادبی دنیا میں اپنی پہچان قائم کر چکے ہیں۔ مجموعہ ''شعر نثر آہنگ'' میں بنیادی طور پر اردو نثر نگاروں کا سماجی وثقافتی زاویوں سے مطالعہ کیا گیا ہے۔ مابعد جدیدیت ان کا پسندیدہ موضوع رہا جس کے لئے انہوں نے کشمیر یونیورسٹی کے مجلّہ ''بازیافت'' میں اپنا پہلا مضمون شائع کیا۔ تحقیق وتنقید کے جو نمایاں امتیازات ہیں ان میں زبان وبیان پر دسترس، شگفتہ بیانی، شیریں اسلوب، تجرباتی شعور، گہرے مطالعے کے ساتھ ساتھ گہرا مشاہدہ، تعمیری رویہ، غیر جانبدار ہونا، اہمیت کے حامل ہیں۔ قدوس جاوید کی تنقیدی کتابوں کا مطالعہ کرتے وقت یہ تمام امتیازات ملتے ہیں۔ علامہ اقبال بھی ان کا پسندیدہ موضوع رہا ہے جن کے حوالے سے انہوں نے دو کتابیں ''اقبال کی جمالیات'' اور ''اقبال کی تخلیقیت'' ۲۰۰۷ء کے نام سے لکھی ہیں۔ کتاب ''اقبال اور تخلیقیت'' سات ابواب پر مشتمل ہے جس میں بخوبی بیان کیا گیا ہے کہ کون سے ایسے اسباب کار فرما رہے جن سے اقبال کی تخلیقیت ایک مخصوص سانچے میں ڈھل گئی۔ ریڈیو کشمیر سرینگر میں ایک انٹرویو دیتے ہوئے بتاتے ہیں:

''شکیل الرحمن اردو میں جمالیاتی تنقید کا سب سے بڑا نام ہے اور یہ

بات درست ہے کہ شکیل الرحمٰن کی کتاب ''غالب اور ہند جمالیات'' اور دیگر تحریروں کا مجھ پر اثر ہوا اور میں نے جمالیاتی نقطہ نظر سے اقبال کا جائزہ لیا اور کتاب کی تصنیف کے پیچھے مرحوم اندرابی کے اسرار کا بھی ہاتھ رہا ہے۔ مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں کہ ادب کے جمالیاتی مطالعے میں میں نے پروفیسر شکیل الرحمٰن کی تحریروں سے استفادہ کیا۔9

مابعد جدید تنقید میں قدوس جاوید کا قابل ستائش کام ''متن معنی اور تھیوری'' ہے۔ ۳۷۵ صفحات اور پندرہ مقالات پر مشتمل اس کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں متن، قرات اور بین المتونیت کے اطلاقی امکانات پر بحث کی ہے۔ دوسرے حصے میں ہیئتی تنقید، تانیثی تنقید، اکتشافی تنقید، ساختیاتی تنقید، پس ساختیاتی تنقید، مابعد جدید تھیوریز کے معنی و مفہوم اور تفہیم و تعبیر کو بڑے منجھے ہوئے اسلوب میں بیان کیا ہے۔ اس کتاب میں ساختیات، جدیدیت، بین المتونیت، ہیئتی اور تانیثی نظریئے کے علاوہ ترقی پسندی پر بھی سیر حاصل بحث شامل ہے۔ مصنف کا خود دعوی ہے کہ:

''متن، معنی اور تھیوری'' اردو ادب میں رائج متعدد غلط اور گمراہ کن تصورات اور مفروضات کو رد کرنے کا دعوی کرتی ہے۔''

احمد علی جوہران کی کتاب ''متن معنی اور تھیوری'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''پروفیسر قدوس جاوید کی تنقید کی اہم خصوصیات مغربی اور مشرقی مطالعات کا توازن، سماجی و ثقافتی اور ادبی روایات کے پیش نظر میں ادب کا مطالعہ اور عصری سماجی، سیاسی اور معاشی تناظرات میں ادب کی تفہیم و تعبیر اور اس کی قدر کے تعین کی کوششیں ہیں۔۔۔انہوں نے ''متن معنی اور تھیوری'' میں مابعد جدید تنقید اور ادبی تھیوریز پر جس سنجیدہ اور مربوط و مفصل انداز میں عالمانہ گفتگو کی ہے اور اس گفتگو میں جس

ژرف نگہی اور دیدہ ریزی کا ثبوت دیا ہے۔۔۔مابعد جدید تنقید کے نظری و علمی مباحث کی تعبیر و تفہیم کے سلسلے میں یہ کتاب یقیناً ایک بنیادی حوالہ ثابت ہوگی۔''[۱۰]

پروفیسر قدوس جاوید کے وسعت مطالعہ ار عالمی ادبیات سے آگہی نے ان کی تنقید کو بے پایاں گہرائی و گیرائی عطا کی ہے۔ بین السطور تصنیفات کے علاوہ آپ کے متعدد مضامین بر صغیر ہند و پاک کے رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں جن میں جدیدیت و مابعد جدیدیت، متن میں معنی کا عمل، مابعد جدید ناول، مابعد جدید افسانہ، مابعد جدیدیت، تخلیقیت اور شاعری کا طلسم، اقبال متن اور بین المتنویت، برف آشنا پرندے ایک مابعد جدید ناول، متن قرات اور معنی کا چراغاں کے علاوہ ولی دکنی، حالی، شبلی، سرسید، محمد حسین آزاد، غالب، اقبال، فیض گوکہ سب کی ادبی عظمت کا جائزہ لیا ہے۔ ان کی طائرانہ نظروں نے اپنے قرب و جوار کے ادیبوں کا بھی حق ادا کیا، مطلب یہ کہ جموں و کشمیر کے لکھنے والوں کی بھی حوصلہ افزائی کے لئے بھی ان کی خدمات اہمیت کی حامل ہیں۔ حامدی کاشمیری کی اکتشافی تنقید، اکبر حیدری، محمد یوسف ٹینگ، منصور احمد منصور، غلام رسول نازکی، ترنم ریاض، خالد حسین، فرید پربتی، مشتاق احمد وانی، مجید مضمر، خالد بشیر، نصرت چودھری وغیرہ کی تصنیفات کے تبصرے اور مطالعے پیش کئے ہیں وہ اپنے طریقہ تنقید و تحقیق کے حوالے سے اپنے آپ میں نئے مطالعے ہیں۔

پروفیسر ضیاء الدین:۔ کشمیر میں اُردو تحقیق و تنقید کی موجودہ صورتِ حال کا کوئی بھی جائزہ پروفیسر ضیاء الدین کے ذکر کے بغیر نامکمل تصور کیا جائے گا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ کم لیکن معیاری اور اچھوتے موضوعات پر قلم اُٹھانے پر یقین رکھتے ہیں۔

پروفیسر ضیاء الدین کے اب تک بیس سے زائد تحقیقی و تنقیدی مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی درجہ ذیل یک موضوعی تصنیفات ان کے تحقیقی ذوق اور تنقیدی بصیرت کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔

۱۔ خواجہ احمد عباس ۲۔ اسالیب نثر ایک نظر

۳۔ گوپال متل ۔شخص اور شاعری ۴۔ اطرافِ تنقید

پروفیسر ضیاء الدین کے تحقیقی وتنقیدی مضامین کا مجموعہ ''اطرافِ تنقید'' (۲۰۰۶ء) میں منظر عام پر آیا۔ ادبی حلقوں میں اس کتاب کی بڑی پذیرائی ہوئی۔ ضیاء الدین عام طور پر روایتی موضوعات پر قلم اُٹھانے سے گریز کرتے ہیں۔ انہوں نے شاعری، افسانہ، ڈرامہ اور سفرنامہ کے حوالے سے معیاری تحقیقی وتنقیدی مضامین لکھے ہیں۔ غالب پر اُردو کے اکثر و بیشتر ناقدین نے لکھا ہے لیکن غالبؔ کی تنقید کے لیے غالب کی تفہیم ضروری ہے اور یہ ایک ایسا دشوار گزار عمل ہے جس پر ہر کس و ناکس کھرا نہیں اُتر سکتا۔ تفہیم غالب کے لئے اُردو اور فارسی شاعری کی روایات اور رسومیات ہی نہیں مشرقی جمالیات کی آگہی بھی لازمی ہے۔ خاص طور پر غالب کی شاعری کے اشاراتی واستعاراتی اسلوب، زبان کے انوکھے لسانی برتاؤ اور غالبؔ کے جدت پسند اختراعی ذہن کو سمجھنے کے بعد ہی غالب شناسی کے میدان میں قدم رکھنا ممکن ہے۔ پروفیسر ضیاء الدین نے غالبیات کے حوالے سے متعدد معرکتہ الارا مقالات لکھے ہیں۔ ان میں سے پانچ مقالات ان کی کتاب ''اطرافِ تنقید'' میں شامل ہیں۔

۱۔ غالب کی ایذا پسندی ۲۔ غالب کی شاعری میں نرگسیت

۳۔ غالب اور جدید شعری ذہن ۴۔ غالب اور تصوف

۵۔ مالک رام غالبیات کی روشنی میں

خواجہ احمد عباس ایک ترقی پسند فکشن نگار، فلم ساز، ہدایت کار اور اُردو ڈرامہ نگار کے طور پر کسی تعارف کے محتاج نہیں لیکن پروفیسر ضیاء الدین نے اُردو افسانہ کی شعریات کو ذہن میں رکھتے ہوئے خواجہ احمد عباس کے افسانوں میں ان کے نظریے کے عمل دخل کا نہایت بصیرت مندانہ تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے اور جدیدیت کے حامیوں کے اس نکتے کو رد کیا ہے کہ ادب میں مقصدیت یا نظریئے کے برتاؤ سے ادب کی جمالیاتی حیثیت مجروح ہوتی ہے۔ پر

وفیسر ضیاء الدین اس سلسلے میں واضح اور متوازن خیالات رکھتے ہیں۔ چنانچہ خواجہ احمد عباس کے افسانوں میں مقصدیت اور تخلیقی و جمالیاتی محاسن کے برتاؤ کے بارے میں ضیاء الدین بڑے ہی غیر جانبدارانہ انداز میں لکھتے ہیں۔

''مقصد اور جذبے کے امتزاج ہی سے اعلیٰ ادب کی تخلیق ہوتی ہے۔ خواہ وہ افسانہ ہو یا ناول، غزل ہو یا نظم، مقصد اور جذبے کا امتزاج تخلیق فن کے لئے ضروری ہے یہ امتزاج خواجہ احمد عباس کی ہر کہانی میں نظر نہیں آتا۔ لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ وہ مقصد اور جذبے کے امتزاج کی اہمیت سے بیگانہ رہے ہوں یہ امتزاج ان کی جن کہانیوں میں موجود ہے وہ کہانیاں اونچے پائے کا ادب پارہ بن گئی ہیں۔[11]

پروفیسر ضیاء الدین کا مذکورہ بالا اقتباس خالصتاً تنقیدی ہے اس میں نہ تو مدلل مداحی ہے اور نہ عیب جوئی بلکہ اپنی ادبی بصیرت کی بنا پر غیر جانبدارانہ خیالات کا اظہار کیا گیا ہے جو تنقید کا فرض منصبی ہے اور اگر پروفیسر ضیاء الدین کی تحریروں کا بہ غور جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ضیاء الدین ریاست جموں وکشمیر کے ایک ایسے بالغ نظر اور پختہ ذہن نقاد اور محقق ہیں جن کا شمار برصغیر کے نمائندہ نوجوان ناقدین میں کیا جانا چاہئے۔

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی:۔ تحقیق وتنقید کے لئے زبان وادب کی روایات اور رجحانات، اقدار اور نظریات کے گہرے شعور کے ساتھ ساتھ صبر وسکون ریاضت اور ادب سے بے لوث وابستگی بھی ضروری ہے۔ یہ صفت کشمیر کے معاصر محققین اور ناقدین میں سب سے زیادہ ڈاکٹر مشتاق وانی کے یہاں نظر آتی ہے۔ مشتاق وانی گذشتہ تین دہائیوں سے ادب کے مختلف شعبوں میں اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ ایک عرصہ تک مشتاق وانی کی شناخت بطورِ افسانہ نگار کی جاتی رہی ہے۔ ان کے افسانوں کا اولین مجموعہ ۲۰۰۱ء میں ''ہزاروں غم'' کے نام سے شائع ہوا۔ اس مجموعے کا پیش لفظ ریاست جموں وکشمیر کے مشہور دانشور جناب امین بنجارہ

نے لکھا تھا۔ افسانہ نگاری کے ساتھ ساتھ مشتاق وانی شاعری سے بھی شوق رکھتے ہیں لیکن ۲۰۰۰ء تک آتے آتے انھیں اور کشمیر کے اُردو قارئین کو بھی اس بات کا شدت سے احساس ہوا کہ مشتاق احمد وانی طبعاً و مزاجاً تحقیق وتنقید کے مردِ میدان ہیں۔ ان کی تصنیف ''تقسیم کے بعد اُردو ناول میں تہذیبی بحران'' نے اس خیال کی تصدیق بھی کردی۔

''تقسیم کے بعد اُردو ناول میں تہذیبی بحران'' (۲۰۰۲ء) میں شائع ہوئی گرچہ یہ مقالہ مشتاق احمد وانی نے شعبہ اُردو جموں یونی ورسٹی کے ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے لیے لکھا تھا لیکن اپنے موضوع کی انفرادیت اور ترتیب اور پیش کش کے اعتبار سے یہ مقالہ یونی ورسٹیوں میں لکھے جانے والے مقالوں سے بہت منفرد بھی ہے اور ممتاز بھی۔ پروفیسر شمیم حنفی نے مشتاق احمد وانی کے اس تحقیقی وتنقیدی مقالہ کے بارے میں درست لکھا ہے کہ۔

''ان کا (مشتاق احمد وانی کا) مقالہ عام تحقیقی مقالات کے برعکس اپنی سطح اور معنویت کے اعتبار سے یقیناً اہمیت کا حامل ہے اور اس سے اُردو فکشن کے ایک اہم پہلو پر روشنی پڑتی ہے وانی صاحب کا طریق کار علمی ہے اور اس میں وہ متانت ملتی ہے جو سنجیدہ مطالعے کے بغیر ہاتھ نہیں آتی۔ مجھے یقین ہے کہ ان کی یہ کتاب شوق سے پڑھی جائے گی اور فکشن سے شغف رکھنے والے اس کی قدر کریں گے۔'' ۱۲

مشتاق وانی کے مذکورہ بالا تحقیقی وتنقیدی کارنامے کی اہمیت اور معنویت کا اعتراف کرتے ہوئے مشہور نقاد اور دانشور پروفیسر عبیدالرحمٰن ہاشمی نے کتاب کے ''پیش لفظ'' میں لکھا ہے۔

''ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کی موجودہ کوشش اس لحاظ سے قابلِ قدر ہے کہ اس کے وسیلے سے اُردو ناول کی عہد بہ عہد بدلتی ہوئی صورت حال کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور خصوصاً آزادی کے بعد زندگی کے رزم نامے

میں ناول کے خصوصی کردار اور عمل کو بھی دیکھا اور سمجھا جا سکتا ہے۔ یوں تہذیبی بحران یہاں قدرے غلط فہمی کو ضرور راہ دیتا ہے اس لیے کہ مصنف کا مقصد تہذیب (culture) کے حوالے سے تاریخی نقوش کو نشان زد کرنے کے بجائے سیاسی وسماجی سطح پر اخلاقی اور معاشرتی زندگی میں پیدا ہونے والے خلفشار کی نشان دہی کرنا ہے۔ چنانچہ انہوں نے گذشتہ پچاس برسوں میں ممتاز ترین فکشن کے کارناموں کو بحث کا موضوع بناتے ہوئے اُن کے فنی وفکری تجزیے سے جو نتائج اخذ کیے ہیں وہ تعمیر کی صحت اور استدلال کی مضبوطی کے سبب ہمیں قائل مطمئن کرتے ہیں'' ۱۳؎

اُردو میں غزل اور افسانہ کے بعد سب سے مقبول صنف ناول ہے۔ اُردو ناول کی تاریخ وتنقید کے حوالے سے پریم چند، علی عباس حسینی، حسن فاروقی اور وقار عظیم سے لے کر پروفیسر ارتضیٰ کریم، اسلم آزاد اور پروفیسر انور پاشا تک نے بہت کچھ لکھا ہے لیکن اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں ہندوستانی تہذیب وتمدن پر مغربی تہذیب وتمدن اور علوم وفنون کے سبب، متحدہ ہندوستان میں جو تہذیبی بحران پیدا ہوا اسے کسی اور محقق اور نقاد نے ایک مستقل موضوع کے طور پر پیش نہیں کیا ہے اور نہ ہی خصوصیت کے ساتھ اُردو کے ابتدائی ناولوں سے لے کر عصر حاضر تک کے ناولوں میں اس تہذیبی کشمکش انشاء اور بحران کی واضح نشاندہی کی ہے۔ حالانکہ ڈپٹی نذیر احمد، رتن ناتھ سرشار، مرزا ہادی رسوؔا اور پریم چند سے لے کر سجاد ظہیر، عزیز احمد اور عصمت چغتائی تک اور قرۃ العین حیدر اور جوگندر پال سے لے کر عبدالصمد، الیاس احمد گدی، حسین الحق، مشرف عالم ذوقی اور سید محمد اشرف تک اُردو کے تمام ناول نگاروں نے عہد بہ عہد رونما ہونے والے سماجی، سیاسی، معاشی اور تہذیبی تبدیلیوں اور اُتار چڑھاو کا کہیں اشاراتی تو کہیں وضاحتی اسلوب میں اظہار خیال تو کیا ہے اور اسی لئے اُردو ناول کو زندگی کا ترجمان اور

عکاس بھی کہا جاتا ہے لیکن اُردو ناول میں اقوام عالم میں تہذیبی بحران کے حوالے سے مشرق خصوصاً ہندوستان اور پاکستان میں رونما ہونے والے تہذیبی بحران کی عکاسی کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ پہلی بار مشتاق احمد وانی نے ہی پیش کیا ہے۔ اس ضمن میں مشتاق وانی نے سائنسی انقلاب، صنعتی انقلاب، انقلاب فرانس وروس کے عالمی اثرات کا بھی جائزہ پیش کیا ہے اور ساتھ ہی مارکس، فرائڈ اور درخیم جیسے فلسفیوں کے نظریات کے ترقی پذیر ممالک کے عوام اور علوم وفنون پر پڑنے والے اثرات کی بھی نشاندہی کی ہے۔ اُردو کے کلاسیکی ناولوں، فسانۂ آزاد اور اُمراؤ جان وغیرہ میں بھی تہذیبی بحران کی عکاسی پر روشنی ڈالنے کے بعد مشتاق وانی نے جدید دور کے ناولوں میں تہذیبی بحران کی نشاندہی کرتے ہوئے اپنے تحقیقی وتنقیدی رویوں کا مظاہرہ جس بصیرت مندی کے ساتھ کیا ہے اس کا اندازہ مذکورہ بالا کتاب ''تقسیم کے بعد اُردو ناولوں میں تہذیبی بحران'' سے ماخوذ ان کے درج ذیل اقتباس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

> ''۱۹۴۷ء کے بعد اُردو میں موضوعاتی اعتبار سے نہ صرف سماج کے گرتے ہوئے ملبے کو پیش کیا گیا ہے بلکہ ہیئتی اعتبار سے بھی ناول کے فرسودہ اصولوں سے انحراف کرنے کو اہمیت دی گئی اور اس چیز کی خاص طور پر کئی ادیبوں کو ضرورت محسوس ہوئی کہ موضوع کے ساتھ ناول کی ہئیت کو بھی بدلا جائے۔ چنانچہ اب کہانی کو سیدھے اور سپاٹ انداز میں آگے بڑھانے کے بجائے اُسے پیچیدہ راستوں سے آگے بڑھانے کی کوشش کی گئی۔ حلقۂ اربابِ ذوق کے زیر اثر علامتی کہانیوں اور علامتی ادب کی تخلیق کا سلسلہ شروع ہوا اور ترقی پسند نے ''شعور کی رَو'' کو اپنا کر تخلیقی ادب میں مزید پیچیدگیاں پیدا کردیں اور انہیں تحریکوں کے زیر اثر سجاد ظہیر کی ناولٹ ''لندن کی ایک رات'' اور عزیز احمد کا ناول ''گریز'' منظر عام پر آئے۔'' ۱۴

مشتاق احمد وانی نے اپنے تحقیقی وتنقیدی مضامین لکھنے کا سلسلہ مسلسل جاری رکھا۔ ۲۰۰۸ء میں ان کے مضامین کا ایک مجموعہ ''آئینہ آئینہ'' کے نام سے شائع ہو کر قبولیتِ عام حاصل کر چکا ہے۔ تحقیقی وتنقیدی مضامین کے دو مجموعے ''شعور بصیرت'' اور ''افہام و تفہیم زبان وادب'' بھی اسی دوران شائع ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کا تازہ ترین تحقیقی وتنقیدی کارنامہ ''اُردو ادب میں تانیثیت'' ہے۔ ۸۰۷ صفحات پر مشتمل یہ تصنیف، تانیثیت کے موضوع پر پہلی جامع تصنیف ہے۔ جس میں مابعد جدیدیت کی ایک اہم شق تانیثیت Feminism کا ایک سماجی وثقافتی رویہ اور علمی وادبی رجحان کی حیثیت سے تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ لیکن مشتاق احمد وانی نے اپنی اس ضخیم تصنیف میں تنقیدی بصیرت سے کم اور جذباتی خیالات سے زیادہ کام لیا ہے۔ انہوں نے تانیثیت کے معنی ومفہوم کی وضاحت مغربی دانشوروں کے فرمودات کے حوالے سے کی ہے۔ عالمی پیمانے پر تانیثیت کے رجحان کے آغاز وارتقاء کی تاریخ انہوں نے تفصیل کے ساتھ پیش کی ہے جن سے مابعد جدید تصور ادب سے واقفیت رکھنے والے ناقدین اور باذوق قارئین واقف ہیں۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ، عتیق اللہ، نظام صدیقی، ابوالکلام قاسمی اور قدوس جاوید وغیرہ نے تانیثیت پر بہت کچھ لکھا ہے۔ خود خواتین میں شہناز بنی، ترنم ریاض، فہمیدہ ریاض، کشور ناہید وغیرہ نے بھی اپنے اپنے انداز میں تانیثیت اور تانیثی شعروادب کے بارے میں مضامین لکھے ہیں۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ مشتاق احمد وانی نے ایسی تمام معلومات کو یکجا کر کے پیش کر دیا ہے۔ اس اعتبار سے ان کی یہ تصنیف تحقیقی اعتبار سے تو اہم ہے لیکن اس میں تنقیدی مباحث اور نتائج کا فقدان ہے۔ بلکہ انہوں نے خواتین کے بارے میں ابتداء سے آخر تک بڑی معصومیت کے ساتھ جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ انسانی اور اخلاقی اعتبار سے قابلِ قدر ہیں۔ لیکن اس طرح کے عام جذبات وتصورات کو نہ تو تحقیق کا نام دیا جا سکتا ہے نہ تنقید کا مثلاً۔ اس کتاب کی تمہید کے درج ذیل اقتباس پر ایک نظر ڈالیں۔

''عورت، خالق کائنات کا ایک عظیم شاہکار ہے اس کی عظمت اور اہمیت

سے بھلا کون انکار کر سکتا ہے۔اس کے کئی روپ ہیں وہ ماں جیسے مقدس رشتے کی علامت بھی ہے اور بیوی کی حیثیت سے اپنے شوہر کی بہترین ساتھ بھی بہن کی صورت میں اپنے بھائیوں کی ہمدرد اور غمگسار بھی اور بیٹی کی حیثیت سے اپنے والدین کی خدمات گزار بھی عرض یہ کہ عورت اپنے ہر روپ میں محبت بھرا دل رکھتی ہے۔قدرت نے اسے حسن و جمال اور آرائش وزیبائش کا ایسا جذبہ عطا کیا ہے کہ وہ ہر چیز کو خوبصورت دیکھنا چاہتی ہے۔دنیا کے تمام دانشوروں، عالموں اور عظیم ہستیوں نے عورت کی عظمت اور اُن کی اہمیت کا اعتراف کیا ہے۔ تاریخ عالم کی سینکڑوں مثالیں عورت کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے کے لئے کافی ہیں۔وہ نہ نفاست میں پیچھے ہے اور نہ ذہانت میں۔اُم المومنین حضرت عائشہؓ اسلام کی سب سے پہلی مفتی قرار دی گئیں۔رحم دلی اور خدمتِ خلق میں مدرٹریسا کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔چاند بی بی اور جھانسی کی رانی کی بہادری کے کارنامے تاریخ میں محفوظ ہی۔اسی طرح کئی خواتین نے بہادری، ذہانت اور ہنرمندی کے بہترین کار نامے انجام دیئے ہیں جنہیں انسانی تاریخ ہرگز فراموش نہیں کرسکتی'' ۱۵

مشتاق احمد وانی کو یہ غلط فہمی ہے کہ تانیثی ادب سے مراد صرف اور محض عورتوں کا لکھا ہوا ادب ہے جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔واقعتاً ہر وہ تحریر جو ادب سمیت زندگی کے تمام شعبوں میں عورت اور مرد کی تفریق ختم کرنے پر اصرار کرے تانیثی تحریر ہے خواہ وہ تحریر کسی عورت نے لکھی ہو یا مرد نے۔چنانچہ مشتاق احمد وانی نے اُردو کی قدیم وجدید خواتین شاعرات اور فکشن نگاروں کی شعری اور نثری تحریروں میں ہی تانیثیت کے عناصر ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے۔لیکن اس ضمن میں بھی انہوں نے نہ جانے کیوں ترنم ریاض، صادقہ نواب سحر، ذکیہ مشہدی

اور لالی چودھری جیسی خواتین کی تحریروں پر زیادہ توجہ نہیں دی ہے جبکہ تانیثیت کو ان خواتین نے اپنی تحروں میں بڑے ہی دانشورانہ انداز میں تمام تر فنی و جمالیاتی خوبیوں کے ساتھ برتا ہے۔
البتہ اُردو ناول میں تانیثیت کی جستجو انہوں نے نذیر احمد، رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر، پریم چند، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی اور قاضی عبدالغفار کے ناولوں میں تو کی ہے لیکن پیغام آفاقی، مشرف عالم ذوقی اور غضنفر کے ناولوں کو زیر بحث لانے کی زحمت نہیں کی ہے جبکہ آفاقی کے ناول مکان، غضنفر کے ناول کینچلی اور مشرف عالم ذوقی کے ناول ''لے سانس بھی آہستہ'' وغیرہ میں تانیثیت کے عناصر وافر مقدار میں موجود ہیں لیکن ان کمیوں کے باوجود اُردو ادب میں تانیثیت ایک اہم تحقیقی وتنقیدی تصنیف ہے جس سے طلباء کو استفادہ کرنے میں بڑی مدد ملے گی۔ اس کتاب میں بھی جہاں مشتاق احمد وانی نے بعض نظموں اور غزلوں کے تجزیے پیش کئے ہیں وہاں انہوں نے اپنی تنقیدی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی پوری کوشش کی ہے پھر بھی یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مشتاق وانی جموں وکشمیر کے ایک ایسے محقق اور نقاد ہیں جن کے ذکر کے بغیر کشمیر میں اُردو تحقیق وتنقید کی موجودہ صورتِ حال کو سمجھا نہیں جا سکتا ہے۔

شہاب عنایت ملک: ۔ کشمیر کے معاصر محققین و ناقدین میں پروفیسر شہاب عنایت ملک کا نام بھی آتا ہے۔ شہاب عنایت ملک نے شعبۂ اُردو جموں یونی ورسٹی کی صدرات کے دوران متعدد سیمینار کروائے۔ ان سیمیناروں میں ریاست جموں وکشمیر کے علاوہ دلی، لکھنؤ اور الہ آباد اور بین القوامی سطح کے دانشوروں نے بھی تحقیقی وتنقیدی مقالے پیش کئے۔ جنھیں بعد میں کتابی صورت میں بھی شائع کیا گیا۔ خود شہاب ملک کی کئی تحقیقی وتنقیدی کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن کا ذکر حسب ذیل ہے۔

۱۔ نئے تنقیدی جائزے

۲۔ قرۃ العین حیدر: بحیثیت افسانہ نگار

۳۔ چاندنی بیگم: ایک جائزہ

۴۔ مضامینِ شہاب

۵۔ ارمغانِ شہان

۶۔ عصری ادبی تفکرات

پروفیسر شہاب عنایت صاحب کی اب تک کم وبیش پندرہ سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔انہوں نے تحقیقی مضامین بھی لکھے ہیں اور مختلف ادبی شخصیات سے متعلق لاتعداد تنقیدی مضامین بھی ضبطِ تحریر لائے ہیں۔اس کے علاوہ انہوں نے غیر افسانوی تحریریں مثلاً سفرنامے وغیرہ بھی لکھے ہیں۔اور اُن کی بیشتر تصانیف میں قدرت اللہ شہاب کے حوالے سے مضامین موجود ہیں۔یہ مضامین اس قدر پُر مغز اور جامع ہیں کہ ان مضامین میں کو جاوید احمد مغل نے ترتیب دے کر کتابی شکل میں شائع بھی کیا ہے۔قدرت اللہ شہاب کی افسانہ نگاری، قدرت اللہ شہاب کا ناولٹ ''یا خدا'' ایک شاہکار،شہاب نامہ میں جموں کی جھلکیاں اور چندراوتی وغیرہ شہاب عنایت ملک کے ایسے مضامین ہیں جو قدرت اللہ شہاب کی فنی بصیرتوں کو ہی اُجاگر نہیں کرتے بلکہ اُن کی تہہ دار شخصیت کے پنہاں گوشے بھی نیاں ہو جاتے ہیں۔ قدرت اللہ شہاب سے پروفیسر شہاب عنایت ملک کا یہ والہانہ رشتہ صرف کتابوں اور تحریروں تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ ان کی شخصیت میں بھی قدرت اللہ شہاب کی بہت ساری خوبیاں بیک وقت جمع ہوگئی ہیں۔پروفیسر شہاب عنایت ملک اپنی سوانحی تصنیف ''یادوں کے لمس'' میں لکھتے ہیں ''میں قدرت اللہ شہاب کا ناولٹ ''یا خدا'' پڑھ کر ان کا شیدائی بن گیا۔آج میری شخصیت میں جو بے باکی کا عنصر ہے وہ قدرت اللہ شہاب کی تحریروں کی وجہ سے ہے''۔

''مضامینِ شہاب'' پروفیسر شہاب عنایت ملک کے مختلف تحقیقی اور تنقیدی مجموعہ ہے۔اس مجموعے میں بیشتر مضامین ادب ادیبوں سے متعلق ہیں جن کا تعلق صوبہ جموں سے ہے۔ان ادیبوں کے فن پر ناقدین نے قلم تو اُٹھایا ہے لیکن ان مضامین میں کہیں کہیں تشنگی باقی تھی شہاب عنایت ملک نے ان ادیبوں کی حالاتِ زندگی کے ساتھ ساتھ ان کی تخلیقات کو بھی

پرکھنے کی ایک اہم کوشش کی ہے۔

ادب کے بعض حلقوں میں یہ بات عام ہوگئی تھی کہ کرشن چندر پونچھ کے رہنے والے تھے لیکن شہاب نے اپنے مضمون ''وادی پونچھ و کرشن چندر'' میں اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی ہے اور واضح کیا ہے کہ کرشن چندر پونچھ میں پیدا نہیں ہوئے تھے بلکہ پانچویں جماعت میں تھے کہ مینڈھر کے ایک اسکول میں داخل کر دیے گئے جہاں ان کے والد اس وقت ڈاکٹر کے فرایض انجام دے رہے تھے۔ اور اصل میں کرشن چندر بھرت پور میں پیدا ہوئے تھے۔

غلام رسول کامگار جموں وکشمیر کے اہم شاعر اور دانشور ہو گزرے ہیں ان کی بہت سی تحریریں ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں۔ ان غیر مطبوعہ تحریروں کی روشنی میں شہاب عنایت ملک نے ان کے فن اور شخصیت سے متعلق اپنی کتاب میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی طرح ''مضامینِ شہاب'' میں اُنہوں نے ترنم ریاض اور اسیر کشتواڑی کے فن کو بھی پرکھنے کی سعی کی ہے۔

''عصری ادبی تفکرات'' پروفیسر شہاب عنایت ملک کی تازہ ترین تصنیف ہے جو ۲۰۱۳ء میں میزان پبلی کیشنز سے شائع ہوئی۔ اس کتاب میں مضامین ومقالات، تاثرات، سفر ناموں کا ایک گلدستہ ہے جن کو اُنہوں نے وقتاً فوقتاً ضبطِ تحریر لایا ہے۔

سعادت حسن منٹو اور فکشن میں ایک چونکا دینے والا نام ہے اور جواہر لعل نہرو ہندوستان کی سیاست میں ایک سنگِ میل کا درجہ رکھتا ہے۔ منٹو کے ایک خط کو مدِ نظر رکھ کر ڈاکٹر شہاب عنات ملک نے جو مضمون تحریر کیا ہے اس سے نہ صرف منٹو کی شخصیت کے نئے نئے جہات سامنے آتے ہیں بلکہ ہندوپاک کی سیاسی تاریخ وثقافت کے اہم گوشوں سے متعلق ایسی جانکاری ملتی ہے جس پر آج بھی سرے سے سوچا جاسکتا ہے جس میں کشمیر بھی خاص طور پر شامل ہے۔

پروفیسر شہاب عنایت ملک نہ صرف اپنے طلبہ واسکالرز میں مشہور ہیں بلکہ جموں یونیورسٹی کی انتظامیہ بھی اُن کی تدریسی صلاحیتوں کے علاوہ اُن کی انتظامی صلاحیتوں کا لوہا بھی مانتی ہے۔ پروفیسر شہاب عنایت ملک نے جموں یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو میں دو چار برسوں

میں تن تنہا جتنے سیمینار، ورکشاپ اور توسیعی خطابات منعقد کروائے ہیں اُتنے کسی اور کے لئے مشکل ہے۔

پروفیسر نصرت چودھری:۔ کشمیر میں اُردو تحقیق وتنقید کے عصری منظرنامے میں ایک خاتون قلم کار بھی شامل ہیں جنھیں ادبی دنیا نصرت چودھری کے نام سے جانتی ہے۔

پروفیسر چودھری ایک پختہ کار شاعرہ بھی تھی اور افسانہ نگار بھی۔ ان کا شعری مجموعہ ''ہتھیلی کا چاند'' (۲۰۰۴ء) میں شائع ہوکر قبول عام کی سند حاصل کر چکا ہے۔ افسانوں کا ایک مجموعہ ''سفر چہرے کا'' کچھ عرصے قبل شائع ہو چکا ہے۔ لیکن اسکے ساتھ ہی نصرت چودھری کو تحقیق وتنقید سے بھی گہری دلچسپی رہی ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ گذشتہ چند برسوں سے نصرت چودھری نے اپنی ساری توجہ تحقیق وتنقید پر مرکوز کر رہی تھی۔ تحقیق وتنقید کے حوالے سے نصرت چودھری کی درج ذیل تصانیف منظرِ عام پر آچکی ہیں۔

۱۔ فیض احمد فیض کی شاعری: ایک مطالعہ

۲۔ فیض احمد فیض: روایت اور انفرادیت

۳۔ اُردو تنقید میں فیض شناسی

۴۔ فیض احمد فیض اور جدید شعری ذہن

۵۔ اُردو کے چند اہم افسانوں کا تجزیاتی جائزہ

۶۔ صوبہ جموں میں اُردو افسانے کا منظرنامہ

مذکورہ بالا تصنیفات کے عنوانات سے صاف ظاہر ہے کہ نصرت چودھری کی تحقیق و تنقید نگاری کا مرکز ومحور فیض احمد فیض رہے ہیں۔ اس بات میں شک نہیں کہ میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کے بعد فیض احمد فیضؔ کو ہی اُردو شاعری کا چوتھا ستون مانا جاتا ہے اور اس سے کسی کو انکار بھی نہیں ۲۰۱۱ء میں فیض صدی کے حوالے سے پورے ہندوستان اور پاکستان ہی نہیں اُردو کی کئی نئی بستیوں میں بھی فیض کے حوالے سے سیمنار، سمپوزیم اور مشاعرے منعقد ہوئے،

سینکڑوں رسالوں نے فیض نمبر یا خصوصی گوشے شائع کیے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اکثر و بیشتر نو جوان ناقدین نے فیض پر نصرت چودھری کی کتابوں سے خوب خوب استفادہ کیا ہے۔ دراصل فیض پر تحقیقی مقالے اور تنقیدی مضامین تو ہزاروں کی تعداد میں لکھے گئے۔ فیض پر لکھی گئی کتابوں کی بھی کمی نہیں لیکن فیض کی شخصیت اور فن ذہن اور ضمیر روایات کی پاسداری اور شاعرانہ انفراد و افسانہ امتیاز کے حوالے سے نصرت چودھری نے اپنی تصنیفات میں جو تحقیقی انکشافات اور تنقیدی نتائج پیش کیے ہیں۔ اس کی مثالیں اُردو کے چند ایک محققین اور ناقدین کی تحریروں میں ہی ملتی ہیں۔ اسی لیے نصرت چودھری کا شمار اُردو کے چند گنے چنے فیض شناسوں میں ہوتا ہے۔

نصرت چودھری کی تحریریں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کسی بھی موضوع پر تحقیقی یا تنقیدی مقالہ قلم بند کرنے سے پہلے وہ اس موضوع سے متعلق بذاتِ خود چھان بین کرتی تھیں۔ محض سنی سنائی یا دوسروں کی لکھی لکھائی باتوں سے متاثر یا مرعوب ہو کر رائے قائم نہیں کرتیں بلکہ متعلقہ حالات کا خود مطالعہ اور مشاہدہ کرتی تھیں۔ ضرورت کے مطابق فن پارہ متن یا متون کو حرف حرف لفظ لفظ خود پڑھ کر اس متن شعر، نظم یا افسانہ کے لسانی پہلوؤں موضوعی معنویت، جمالیاتی محاسن اور فنی انفراد اور تہہ داری کی نشاندہی تحقیقی شواہد اور تنقیدی افکار دلائل کے ساتھ کرتی ہیں۔ نصرت چودھری کسی پختہ کار دانشور کی طرح اول تو اپنے تحقیقی منصوبے کا مقصد قائم کرتی ہیں اور پھر موضوع کی معنویت کو سمجھنے سمجھانے کے لیے موضوع سے متعلق سوالات کرتی تھیں۔ تحقیق کے مرحلوں سے گزر کر ان کے جوابات تنقیدی تجزیوں کے ساتھ سامنے لاتی تھیں۔ مثلاً نصرت چودھری نے اپنی کتاب ''فیض احمد فیض : روایت اور انفرادیت'' کے پیش لفظ میں یہ سوال قائم کیا ہے کہ۔

''وہ کون سا اسم اعظم ہے جس کے باعث نہ صرف موجودہ صدی کے متعدد شعراء اور خاص کر اپنے معاصرین میں انہوں نے اپنے انفرادی

وجود اور مقام کو اپنائے رکھا ہے؟" [16]

فیض کی شاعرانہ عظمت کے اسرار کھولنے والے ان دلائل کی نشاندہی بھی کی ہے جن پر فیض کی شاعری سے متعلق ان کا تحقیقی وتنقیدی مقالہ قائم ہے۔ مثلاً نصرت چودھری نے مذکورہ سوال کے جواب میں خود لکھا ہے۔

۱۔ فیض تجربہ پسند اور بغاوت کے حاوی مروجہ میلانات سے گزرنے کے باوجود خود ضبطی، توازن اور اعتدال کو رواں رکھ کر اپنی جداگانہ حیثیت قائم رکھے ہوئے ہیں۔

۲۔ وہ روایت سے ہم رشتہ ہونے کے باوجود اپنی شخصیت اور عصری آگہی کی بنا پر روایت کے اسیر ہو کر نہیں رہے بلکہ روایت کے ایک نئے شعور کی آبیاری کی۔

۳۔ فیض لاشعوری تجربات کے ساتھ ساتھ شعوری تجربات سے بھی استفادہ کرتے ہیں۔ اسی لئے کے تخلیقی عمل کا انحصار شعوری اور لاشعوری دونوں طرح کے محرکات پر ہوتا ہے۔

۴۔ اُردو شاعری کے روایتی موضوعات مثلاً عشق، رومانیت، جنس، جمالیات، سماجی تضادات کے علاوہ سیاست، تحریکِ آزادی، وطنیت اور عالمی سیاسیت وغیرہ کے برتاؤ میں وہ اپنے منفرد تخلیقی رویّے کو بروئے کار لاتے ہی۔

۵۔ فیض کی شاعری پر چند منتخب کلاسیکی شعراء کے ساتھ ساتھ بعض مغربی شاعروں کے اثرات نظر آتے ہیں۔

فیض کی شاعری کی ایک نمایاں انفرادیت ان کی منفرد زبان بھی ہے۔ اس ضمن میں نصرت چودھری نے بجا طور پر لکھا ہے۔

"نئے شعراء کے سامنے فیض احمد فیضؔ کی زبان بھی تھی۔ فیض نے اختر الایمان کی طرح نئے الفاظ استعمال نہیں کیے اور نہ ہی میرا جی کی طرح ایک لچکدار زبان برتی۔ انہوں نے زبان میں کوئی تبدیلی پیدا نہ کی بلکہ روایتی زبان ہی کو اپنا وسیلہ اظہار بنایا۔ ان کی علامتیں بھی اُردو

شاعری کے روایتی الفاظ سے ماخوذ ہیں۔ لیکن ان کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ناگزیر الفاظ کی شناخت کی اور پھر لفظوں کی مرکبات سے شعری لسانیات کو ایک دل پزیر شکل عطا کی اور زبان کو نئے ادراک کے ساتھ استعمال کیا۔'' ۱۷

ڈاکٹر ریاض احمد:۔ ڈاکٹر ریاض احمد کے اب تک بیس سے زائد مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ ریاض احمد ایسے اُردو قلم کار ہیں جو زیادہ نہیں عمدہ اور معیاری لکھنے کے قائل ہیں۔ تحقیق و تنقید کے معاملے میں وہ ''سرسری ہم جہان سے گزرنے'' کے قائل نہیں ہیں۔ اسی لئے کسی بھی موضوع پر مضمون سپردِ قلم کرنے سے پہلے وہ اس موضوع سے متعلق تمام ضروری معلومات اور مواد جمع کر کے ان پر غور وفکر کرتے ہیں، پھر اپنے ذوقِ تحقیق اور شعورِ تنقید کی مدد سے اس موضوع سے متعلق تحقیقی و تنقیدی نتائج سامنے لاتے ہیں۔ ان میں جدت اور تازہ کاری تو ہوتی ہی ہے ساتھ ہی ان سے تحقیق و تنقید کے سرمائے میں اضافہ بھی ہوتا ہے۔

ڈاکٹر ریاض احمد کے مضامین ہندوستان اور پاکستان کے مختلف رسائل میں بکھرے پڑے ہیں۔ ابھی تک انہوں نے اپنے مضامین کا مجموعہ شائع نہیں کروایا ہے لیکن مختلف یونیورسٹیوں کی جانب سے شائع ہونے والی کتابوں میں شامل ہیں۔ ڈاکٹر ریاض احمد کی اب تک صرف ایک تحقیقی و تنقیدی تصنیف ''ترقی پسند تحریک اور اُردو ناول'' ۲۰۰۷ء میں شائع ہوئی ہے۔ ریاض احمد کی یہ تصنیف موضوع کے اعتبار سے بے حد اہم تصنیف ہے کیونکہ ترقی پسند تحریک اور ترقی پسند شاعری، ترقی پسند افسانہ پر تو خلیل الرحمٰن اعظمی، سردار جعفری اور پروفیسر محمد صادق کی کتابیں موجود ہیں۔ ناول پر بیسویں صدی میں اُردو ناول (یوسف سرمست) برصغیر میں اُردو ناول (خالد اشرف) اور آزادی کے بعد اُردو ناول جیسی کتابیں بھی لکھی گئی ہیں لیکن ترقی پسند تحریک اور اُردو ناول کے موضوع پر ریاض احمد کی تصنیف پہلی تصنیف ہے۔

ہر شخص جانتا ہے کہ اُردو میں آج تک جتنی بھی تحریکات سامنے آئی ہیں ان میں سر

سید تحریک کے بعد سب سے اہم کارنامے ترقی پسند تحریک نے ہی انجام دیے ہیں۔ دوسری جانب ترقی پسند تحریک کے زیر اثر جو ناول لکھے گئے۔ ان سے اُردو ناول کے موضوع اسلوب اور ہئیت وتکنیک میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ ادب کو عام آدمی کے جذبات ومسائل اور زند گی اور زمانہ کے حقائق سے جڑے رہنے کا سلیقہ اصلاً ترقی پسند ناولوں کے وسیلے سے ہی سامنے آیا۔ ڈاکٹر ریاض احمد نے اپنی اس تصنیف میں ترقی پسند تحریک اور ناول کے ایسے تمام مضمرات کی نشاندہی بڑی دیدہ ریزی اور بصیرت مندی کے ساتھ کی ہے۔

ترقی پسندی اور ترقی پسند ناول کے حوالے سے ریاض احمد نے روایتی مفروضیات اور مدرسانہ تاثرات کا اظہار نہیں کیا ہے بلکہ اپنے مطالعہ کی وسعت اور تحقیقی مشقت سے کام لے کر جو کچھ بھی لکھا ہے اسے تازہ کار، غیر روایتی اور تعمیری تنقید ہی کہا جاسکتا ہے۔ اس بات کا اندازہ ریاض احمد کی مذکورہ کتاب کے چند فقروں سے ہی لگایا جاسکتا ہے۔

"ترقی پسند ادبی تحریک کو تاریخ کے بندھن میں قید کرنا قطعاً درست نہیں کیوں کہ ظلم و جبر، استحصال، ذات پات، فرقہ واریت، دلتوں کے حقوق، غریب کسانوں اور مزدوروں کی مفلوک الحالی سے ہمیشہ شعراء اور ادباء کے دل متاثر ہوتے رہے ہیں۔" [۱۸]

ڈاکٹر ریاض احمد کی یہ تحقیقی وتنقیدی تصنیف، ترقی پسند تحریک اور اُردو ناول کے سفر کے حوالے سے غیر روایتی انداز میں کئی ایسے زاویوں کو سامنے لاتی ہے جن پر ابھی تک ترقی پسند تحریک اور اُردو ناول کے ناقدین نے توجہ نہیں دی تھی۔ سجاد ظہیر کی تصنیف "روشنائی"، خلیل الرحمٰن اعظمی کی اُردو میں ترقی پسند تحریک اور علی سردار جعفری کی کتاب "ترقی پسند ادب" سے قطعِ نظر، ریاض احمد نے ایک طرف تو جارج لوکاچ، رالف فاکس، ٹیری انگلٹن اور پیری اینڈرسن جیسے نومارکسی (Neo Marxist) دانشوروں کی مارکسی جمالیات سے متعلق تازہ ترین تشریحات وتوضیحات کو بھی ذہن میں رکھا ہے۔ ساتھ ہی ڈاکٹر عبدالعلیم، اصغر علی انجنیئر،

ڈاکٹر ممتاز حسین، سبط حسن، محمد علی صدیقی، ڈاکٹر اختر اور پروفیسر قمر رئیس تک نے ترقی پسند تحریک سے متعلق جن پس نوشت محرکات اور حقائق وواقعات کی نشاندہی کی ہے، ریاض احمد نے اپنی تصنیف میں انھیں بھی سامنے رکھا ہے۔ اسی طرح ترقی پسند ناولوں میں سماجی وتاریخی شعور، ہئیت وتکنیک اور اسلوبیاتی وجمالیاتی تنوع کو بھی زیر بحث لانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ نظریات اور تخلیقی وجمالیاتی محاسن کو توازن وتناسب کے ساتھ برتنا کمال فن کاری کا تقاضہ کرتا ہے اور ترقی پسند ناول نگاروں میں سے اکثر وبیشتر نے اس کا مظاہرہ اپنے طور پر کس کس انداز میں کیا ہے۔ ریاض احمد نے کی اس نشاندہی غیر جانبدارانہ تحقیقی وتنقیدی شعور کے ساتھ کی ہے۔ مشہور ترقی پسند دانشور اور نقاد پروفیسر قمر رئیس نے ڈاکٹر ریاض احمد کی اس تصنیف کے بارے میں لکھا ہے۔

ڈاکٹر ریاض احمد نے اپنے اس مطالعہ میں اُردو ناول کے ترقی پسند کردار کا تشخص بڑی محنت اور خوبی سے کیا ہے۔ انہوں نے جا بجا طور پر ترقی پسندی کو اُردو ناول کے ایک غالب رجحان کے طور پر سمجھا اور پیش کیا ہے۔ اس میدان میں پریم چند اور ان کے دوسرے معاصرین کے رویوں کا جائزہ بھی انہوں نے علمی استدلال سے لیا ہے لیکن اس کا اصل موضوع ترقی پسند تحریک سے وابستہ ادیب ہی رہے ہیں۔ کرشن چندر، عصمت چغتائی اور عزیز احمد سے شروع ہو کر یہ سلسلہ عبدالصمد اور اقبال مجید کے عہد تک جاری ہے۔

ڈاکٹر ریاض احمد کی مذکورہ بالا تصنیف اور دیگر متفرق تحقیق وتنقید مقالوں کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ریاض احمد ایک با مطالعہ اور با شعور نقاد ہیں۔ وہ قارئین تک اپنے ماضی الضمیر کی ترسیل کا ہنر جانتے ہیں۔ ان کے اسلوب سے خود اعتمادی ٹپکتی ہے، اظہار وبیان کے معاملے میں وہ کلیم الدین اور قمر رئیس سے متاثر نظر آتے ہیں۔ مختصر، سادہ، سہل اور عام فہم الفاظ وتراکیب کے ذریعے وہ اپنے خیالات کا اظہار تقلیل لفظی (Economy of words) کے ساتھ شگفتہ انداز میں اس طرح کرتے ہیں کہ قاری کو ان کے تحقیقی انکشافات

اور تنقیدی تجربات کی تفہیم میں کوئی دشواری اور اُلجھن پیش نہیں آتی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ کشمیر کے موجودہ محققین و ناقدین میں ڈاکٹر ریاض احمد کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

اکیسویں صدی میں جموں وکشمیر میں اُردو تحقیق و تنقید کی صورتِ حال کے حوالے سے مذکورہ بالا محققین اور ناقدین کے علاوہ بھی کئی اور ناقدین ہیں جنہوں نے آٹھویں نویں دہائی میں اُردو تحقیق و تنقید کے میدان میں بڑے ہی طمطراق کے ساتھ قدم رکھا لیکن پھر ان کی دلچسپیاں دوسرے شعبوں کی طرف مڑ گئیں۔ ایسے لوگوں میں درج ذیل حضرات کے اسمائے گرامی اہم ہیں۔

پروفیسر مجید مضمر (مرحوم):۔ اب تک ان کی تین کتابیں منظر عام پر آئی ہیں۔ (۱) اُردو میں علامتی افسانہ (۲) کشمیری ڈرامہ (۳) رنگ باتیں کریں (مضامین کا مجموعہ) اس کے علاوہ مجید مضمر نے علامہ اقبال، علی محمد لون، حامدی کاشمیری وغیرہ پر بھی تحقیقی و تنقیدی مضامین لکھے ہیں۔

مجید مضمر ایک روشن دماغ نقاد ہیں اُن کی تحریریں بتاتی ہیں کہ وہ نہ صرف شعر وادب کا مطالعہ نئے زاویوں سے کرنے پر یقین رکھتے ہیں، بلکہ موضوع کے نادیدہ گوشوں کو روشن کرنے کا رویہ بھی اپناتے ہیں۔ چنانچہ بیسویں صدی کی ساتویں آٹھویں دہائی سے لے کر ۲۰۱۲ء تک مجید مضمر کی جتنی بھی تحریریں سامنے آئی ہیں موضوعاتی اور اسلوبیاتی اعتبار سے ہی نہیں متن سے اخذ معنی تخلیقی تجربات کی بازیافت اور فن پارہ کے لسانی، ادبی اور فکری پہلوؤں کے تجزیہ کے حوالے سے مجید مضمر کی دیدہ ریزی اور بصیرت مندی ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ مجید مضمر کا شمار اُردو کے معتبر نئے نقادین میں ہوتا ہے جن کی اکثر و بیشتر تحریریں کشمیر کی اُردو تنقید میں اضافے کا حکم رکھتی ہیں۔ مجید مضمر کی اب تک تین کتابوں ''اُردو میں علامتی افسانہ''، ''رنگ باتیں کریں''، ''علی محمد لون کا فن'' کے علاوہ متعدد مضامین شائع ہیں۔ جو ادھر اُدھر رسالوں میں بکھرے پڑے ہیں۔ لیکن مجید مضمر کی تنقید کا مرکزی نقطہ اور

بحیثیت نقاد اُن کی شناخت کا بنیادی حوالہ افسانہ کی تنقید رہا ہے۔ مجید مضمر کی تصنیف ''اُردو کا علامتی افسانہ'' یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ انہوں نے اپنے گہرے ادبی ذوق سے کام لے کر افسانوی تنقید کا حق ادا کر دیا ہے۔ لیکن یہ تو ایک عام سی بات ہے۔ مجید مضمر کا امتیاز یہ ہے کہ اُن کی تصنیف ''اُردو کا علامتی افسانہ'' موضوع کے اعتبار سے علامتی اُردو افسانہ کا اولین تنقیدی جائزہ ہے۔ ۶۰۔۱۹۵۵ء کے آس پاس سے جدیدیت کے رجحان کے تحت اُردو افسانہ میں جو نیا اسلوب حاوی رہا وہ افسانہ کا علامتی اسلوب ہی تھا۔ اگرچہ افسانہ میں ثقافتی اور مذہبی علامتوں کا برتاؤ کوئی نئی چیز نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ انتظار حسین، اقبال مجید، رشید امجد، محمد منشا، سریندر پرکاش، بلراج منیرا اور ظفر اوگانوی سے قطع نظر اُردو میں جو علامتی افسانے لکھے گئے اُن کی چند خامیاں بھی تھی۔ اکثر و بیشتر افسانوں میں علامت سازی کا عمل تو ملتا ہے لیکن ان میں سماجی و ثقافتی حقائق و مسائل کے حوالے سے معنی خیز گہرائی نہیں ملتی۔ حد درجہ ذاتی یا پھر غیر مانوس علامتوں کے استعمال اور علامت کو افسانے کے آغاز سے انجام تک ایک ہی معنی میں برتنے کی عدم صلاحیت کے سبب اکثر و بیشتر علامتی افسانے چیستان بن کر رہ گئے۔ مثلاً بلراج مینرا نے ''پورٹریٹ ان بلیک اینڈ بلڈ'' سریندر پرکاش نے ''تلقارمس'' اور ظفر گانوی نے ''انٹراموراسس'' کے عنوان سے جو تحریریں علامتی و تجریدی افسانہ کے نام سے پیش کی ہیں انہیں چاہے کچھ بھی نام کیوں نہ دے دیا جائے افسانہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا تھا۔ کیونکہ افسانہ سادہ اسلوب میں لکھا جائے یا علامتی اسلوب میں، تجریدیت کی تکنیک اپنائی جائے یا میجک تکنیک کی ضروری ہے کہ قاری اپنی قرات کے ذریعے جب افسانے کو نچوڑے تو اس سے افسانویت یا کہانی پن ٹپکے کیونکہ کہانی پن ہی افسانے کا اصل اور بنیادی صنفی جوہر ہے، لیکن مذکورہ افسانوں میں یہ بات نظر نہیں آتی ان کے برعکس ان ہی افسانہ نگاروں کے افسانے مثلاً بلراج مینرا کا ''ماچس''، سریندر پرکاش کا ''دوسرے آدمی کا ڈرائینگ روم'' اور ظفر اوگانوی کا ''بیچ کا ورق'' بہترین علامتی افسانے ہیں۔ پروفیسر مجید مضمر نے اپنی تصنیف ''اردو کا علامتی افسانہ''

میں علامت کے معنی و مفہوم، علامت نگاری کی تاریخ اور ادب میں علامت کے برتاؤ کی نزاکتوں کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے اُردو میں علامتی افسانہ کی خوبیوں اور خامیوں کا بہترین تجزیہ پیش کیا ہے۔ مجید مضمر نے اپنی کتاب کے آغاز میں خود لکھا ہے:

''موجودہ صدی کی چھٹی دہائی سے اب تک جو افسانوی سرمایہ سامنے آ چکا ہے وہ نہ صرف اپنی مقدار کے لحاظ سے بلکہ معیار اور کیفیت کے اعتبار سے بھی ایک علحدہ وجود منوا چکا ہے۔ افسانہ کی یہ منفرد صورت زیادہ تر علامتی ور تخلیقی برتاؤ سے متشکل ہوئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ علامتی افسانہ نے اظہار کی سطح پر عصرِ جدید کی پیچیدگیوں کا ساتھ دیا، فارمولا زدہ کہانی کا قلع قمع کر دیا اور سطحی رومانیت اور کھوکھلی جذباتیت کے ساتھ ساتھ خارجیت، وضاحت پسندی اور برہنہ مقصدیت کا انہدام کر کے افسانہ کے فنی تشخص کی تعمیر اور ادبی اقدار کی بحالی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ یوں بھی شعری تخلیق کی طرح، افسانہ فن کار کی تخلیقی شخصیت کی جملہ توانائی، تابنا کی اور اسراریت کا حامل ہوتا ہے اور ایک ناگزیر، قائم بالذات لسانی و تخلیقی وجود رکھتا ہے، اس کا جوہر بھی وضاحت، تکرار، طوالت اور خالص بیانیہ کے غیر تخلیقی عناصر کی بجائے ارتکاز، تہہ داری، داخلیت اور تجربے کے علامتی ادراک و اظہار میں ہی کھلتا ہے اُردو افسانہ میں اس نوع کا تخلیقی رجحان، جسے ہم علامتی رجحان کے نام سے پہچانتے ہیں، باقاعدہ طور پر ۱۹۵۵ء کے آس پاس شروع ہوا۔ لیکن اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں کے جدید اُردو افسانہ کی پشت پر پریم چند، یلدرم، منٹو اور بیدی جیسے افسانہ نگاروں کی جو قابل قدر میراث ہے۔ اسے یکسر نظر انداز کر دیا جائے۔''[19]

مجید مضمر نے مذکورہ کتاب کے پہلے ہی مضمون ''ادب اور علامت'' میں علامتی عمل کی قدیم اور موجودہ صورت اور الفاظ کے علامتی برتاؤ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

''زبان انسانی ذہن کی سب سے اہم اور پُر اسرار پیداوار ہے۔ زبان کے بغیر واضح خیال کا وجود بہت حد تک ناممکن ہے۔ ماہرین لسانیات کے مطابق زبان کی ابتدا کا اصل سبب انسان کے ''حقیقت کو علامتی روپ میں دیکھنے'' کا رجحان ہے۔ سوسین لینگر کے خیال میں زبان علامتوں کے آزادانہ اور بھرپور استعمال اور تخیلات و تصورات کا ذریعۂ اظہار ہے۔ تجربے کو علامتی شکل میں تبدیل کرنے کا رجحان قوت گویائی کا پہلا قدم ہے۔ زبان اپنی ترقی یافتہ صورت میں ایک دہرا علامتی نظام ہے کہ ایک تو اس میں وہ اصوات شامل ہیں جو مختلف خیالات، حقائق اور اشیا کی علامتیں ہیں اور جنہیں ہم الفاظ کہتے ہیں۔ دوسرے وہ بصری علامتیں جن کو صوتی علائم کا قائم مقام تصور کیا جاتا ہے اور جو ہماری زبان کے تحریری حروف یا الفاظ ہیں۔ تقریری اور تحریری دونوں صورتوں کے علامتی سلسلے مل کر ایک جامع نظام علائم فراہم کرتے ہیں جو انسان کے کرداری عمل کو اسقدر ہمہ گیر اور جامع بناتا ہے۔'' [۲۰]

اُردو علامتی افسانہ کا دیباچہ پروفیسر حامدی کاشمیری نے لکھا ہے۔ ان کی رائے میں:

''مجید مضمر کی تنقید سے ان کے متوازن اور دقیقہ رس ذہن کا اندازہ تو ہوتا ہی ہے تاہم اس سے بڑھ کر ان کے ذہن کی نمایاں خوبی یہ ہے کہ وہ افسانے کا مطالعہ مکتبی انہ انداز سے نہیں، بلکہ ایک ایسے بیدار مغز ناقد کی حیثیت سے کرتے ہیں جو اپنی ترجیحات و تعصّبات سے بالاتر ہو کر اس (افسانے) کے اسراری وجود میں ڈوب جاتے ہیں اور سراغ فن

پاتے ہیں۔ وہ غیر مشروط ذہن سے جدید افسانے کی جانب رجوع کرتے ہیں۔ چونکہ جدید ادب تمام عاید کردہ نظریات کی نفی کرتا ہے اس لئے مجید مضمر کا کام آسان ہو جاتا ہے۔ اس سے بڑھ کر ان کی تنقیدوں کی خوبی یہ ہے کہ وہ افسانے کا تعارف یا اس کی تلخیص پیش نہیں کرتے بلکہ اس کے لسانی دروبست اور اس کی استعاراتی اور علامتی ساخت کی تجزیہ کاری پر تکیہ کرتے ہیں۔ اس ضمن میں انور سجاد، انتظار حسین، رشید امجد اور قرۃ العین حیدر کے افسانوں سے متعلق ان کے مقالے بطورِ خاص قابل ذکر ہیں۔"[۲۱]

مجید مضمر نے اپنی تصنیف میں جن عنوانات کے تحت علامت، علامت نگاری اور علامتی افسانہ نگاری کے معیار، نزاکتوں اور شرائط کا تنقیدی جائزہ لیا ہے، اس کا اندازہ آپ کی تصنیف "اُردو کا علامتی افسانہ" کے ابواب سے لگایا جاسکتا ہے جو اس طرح ہیں۔

۱۔ ادب اور علامت

۲۔ صنفِ افسانہ کے تخلیقی امکانات

۳۔ اُردو افسانہ میں علامتی برتاؤ۔ روایت اور تجربہ

۴۔ قرۃ العین حیدر کا تخلیقی برتاؤ

۵۔ انتظار حسین کا فن۔ گمشدہ ماضی کی بازیافت

۶۔ انور سجاد کی افسانوی کائنات

۷۔ رشید امجد۔ ریت کے پیکروں کا خالق

۸۔ علامتی افسانہ کے پیچ وخم'

'اُردو کا علامتی افسانہ' ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا تھا اس کے بعد مجید مضمر کے تنقیدی مضامین کا ایک مجموعہ "رنگ باتیں کریں" کے نام سے شائع ہوا۔ اس کتاب میں "اُردو

افسانے کی تنقید''، ''میر تقی میر اور اُردو تنقید'' کے علاوہ فیض احمد فیض، حکیم منظور اور حامدی کاشمیری کی شاعری کا مطالعہ یہ ثابت کرتا ہے کہ مجید مضمر ایک مکمل نقاد ہیں اور شعر و ادب کی تنقید کے عمل سے گزرتے ہوئے۔ جس وسیع مطالعہ، نگاہ تیز اور تجزیاتی شعور کی ضرورت ہوتی ہے، مجید مضمر ان تمام اوصاف سے متصف تھے۔ اس کا اعتراف حامدی کاشمیری، مرغوب بانہالی، غلام رسول ملک، شفیع شوق، اور رشید مجروح جیسے تمام دانشوروں کو ہے۔ بقول پروفیسر قدوس جاوید ''ضرورت اس بات کی ہے کہ اب جبکہ مجید مضمر ہمارے درمیان نہیں ہیں کشمیر میں اُردو تنقید کے میدان میں ان کی خدمات کا تفصیلی اور سنجیدہ مطالعہ سامنے لایا جائے۔''

پروفیسر اسد اللہ وانی:۔ پروفیسر اسد اللہ وانی گذشتہ تیس برسوں سے تحقیق و تنقید سے وابستہ ہیں۔ ان کے مطبوعہ مضامین کی تعداد پچاس سے زائد ہے۔ اقبالیات سے انھیں خاص دلچسپی ہے، اس ضمن میں ''اقبالیاتِ آزاد'' کے عنوان سے ان کی تصنیف مشہور ہے۔ ''شیخ العالم ایک مطالعہ'' میں اس اللہ وانی نے تحقیق نگاری کی عمدہ مثال پیش کی ہے جبکہ ''کشمیر میں اُردو افسانہ'' ان کے تنقیدی شعور کا ثبوت ہے۔

پروفیسر نذیر احمد ملک :۔ پروفیسر نذیر احمد ملک اصلاً ''لسانیات'' کے مرد میداں ہیں۔ لسانیات کے حوالے سے ان کی دو تحقیقی و تنقیدی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

۱۔ کشمیری سرمایہ الفاظ کے سر چشمے

۲۔ اُردو رسم خط ارتقاء اور جائزہ۔

اس کے علاوہ انہوں نے اقبال، سعادت حسن منٹو اور اُردو ناول۔ کے حوالے سے بھی چند تنقیدی مضامین لکھے ہیں۔ مافی چاہتا ہوں مواد کے دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے پروفیسر نذیر احمد کے اوصاف و نقائص کا تفصیلاً جائزہ پیش نہیں کر سکا۔

پروفیسر محمد زماں آزردہ:۔ پروفیسر محمد زماں آزردہ بنیادی طور پر انشائیہ نگار ہیں۔ ان کے کشمیری انشائیوں کے مجموعے ''ایسے'' پر انھیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ مل چکا ہے۔ اُردو میں

ان کا واحد تحقیقی وتنقیدی کارنامہ ''سلامت علی دبیر: حیات اور کارنامے'' ہے جو دراصل ان کا وہ مقالہ ہے جس پر انھیں لکھنؤ یونی ورسٹی نے ڈاکٹر آف فلاسفی (پی۔ایچ۔ڈی) کی ڈگری تفویض کی تھی۔ یہ مقالہ مرزا سلامت علی دبیر کی حیات اور کارناموں کے بارے میں ایک عمدہ تحقیقی وتنقیدی تصنیف تصور کیا جاتا ہے۔ محمد زماں آزردہ نے اس کے علاوہ بھی چند عمدہ تحقیقی و تنقیدی مضامین لکھے ہیں۔

اپنی واحد تحقیقی اور تنقیدی تصنیف ''سلامت علی دبیر: حیات اور کارنامے'' میں ڈاکٹر زماں اذردہ نے مرزا دبیر کا بچپن، خاندانی پس منظر، ان کا شجرۂ نسب، تعلیم، ذرائعِ معاش، ان کے سفر، قیامِ لکھنؤ، صحافتی اور فلمی اداروں کے ساتھ وابستگی اور آخر میں وفات وغیرہ سے متعلق تفصیلی بحث ومباحثہ کیا گیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ دبیر کی شخصیت کے پنہاں گوشوں کو سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے جس میں ان کی گھریلو زندگی، مذہبی اور سیاسی اعتقادات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

محمد زمانؔ آزرودہ کی تحقیقی اور تنقیدی تصنیف اور چند تنقیدی مضامین سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ وہ ایک سنجیدہ اور باصلاحیت ادیب، باذوق اور صاحبِ نظر نقاد، ایک محنتی اور ذمہ دار محقق اور ایک ایماندار اور پُرخلوص اُستاد تھے۔ ان کی تحریریں خواہ تنقید سے متعلق ہوں یا تحقیق سے، اُردو زبان وادب سے متعلق ہوں یا کشمیری زبان وادب سے تاریخ وتمدن سے متعلق ہوں یا تہذیب وثقافت سے اُن میں فلم کی بات کہی گئی ہو یا عوامی زندگی کی غرض یہ کہ کوئی پہلو کیوں نہ ہو تمام مضامین موضوعات کی بوقلمونی اور خشکی کے باوجود ان کے اسلوب نگارش، طرز اظہار اور طریقہ استدلال کی بدولت ایسی حلاوت وشیرینی میں ڈھل جاتے ہیں کہ قاری کی طبیعت بوجھل یا گرانباری کا شکار نہیں ہوتی۔ ان کی نثر شگفتہ، رواں، آساں اور عام فہم مگر زوردار اور پُراثر ہے انھوں نے ابتدا میں ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے اپنا لوہا منوایا یا بعدازاں ایک نقاد اور محقق کے طور پر بھی اپنی شخصیت تسلیم کروائی۔ انھوں نے اُردو زبان وادب

کے علاوہ کشمیر اور بیرون کشمیر کی شخصیات کے ساتھ ساتھ دوسرے موضوعات پر بھی قلم اُٹھایا اور جاندار تحریریں پیش کیں۔ ''سلامت علی دبیر۔ حیات اور کارنامے'' سے ان کے وسعتِ مطالعہ کی کشادہ نظری، عمیق مشاہدہ، تجربہ علمی، محققانہ بصیرت کا بین ثبوت ہیں۔

ڈاکٹر عبدالحق نعیمی:۔ معاصر ناقدین میں عبدالحق نعیمی ایک با مطالعہ محقق اور نقاد ہیں۔ اب تک ان کی کئی تحقیق وتنقیدی تصنیفات منظرِ عام پر آچکی ہیں۔

۱۔ اُردو میں عربی وفارسی کے اقوال ضرب الامثال

۲۔ دریا بہ دریا جو بہ جو (پروفیسر ظہورالدین کی شخصیت اور فن پر مضامین کا مجموعہ)

۳۔ قران حکیم کی فصاحت وبلاغت

۴۔ تعبیر وتفہیم

اس کے علاوہ عبدالحق نعیمی نے افسانہ، تنقیدی، شاعری اور اقبالیات کے حوالے سے متعدد مضامین بھی لکھے ہیں۔

ڈاکٹر شفق سوپوری:۔ شفق کا شمار اُردو کے معتبر معاصر شاعروں میں ہوتا ہے۔ ان کے کئی شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں ان میں ''آب رواں'' کو کافی شہرت ملی۔ شفق سوپوری نے شاعری اور موسیقی کے تعلق سے کئی کتابیں شائع کی ہیں۔ اس کے علاوہ عروض وبلاغت، افسانہ، انشائیہ وغیرہ کے حوالے سے بھی ان کے متعدد مضامین شائع ہو چکے ہین۔ شفق سوپوری کی تحقیقی وتنقیدی تصنیفات میں درج ذیل اہم ہیں۔

۱۔ غ۔م۔طاوس: ایک مطالعہ

۲۔ کلام فیض کا عروضی مطالعہ

۳۔ اُردو غزل اور ہندوستانی موسیقی

۴۔ مخزن موسیقی

۵۔ موسیقی، شاعری اور لسانیات

۶۔ جہات (تحقیقی وتنقیدی مضامین کا مجموعہ)

ڈاکٹر نذیر آزاد:۔ شفق سوپوری کی طرح نذیر آزاد کا بھی پہلا عشق شاعری ہے۔نذیر آزاد کی غزلیں اور نظمیں ہندوپاک کے موقر رسالوں میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔کئی شعری مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ تحقیق وتنقید کے حوالے سے نذیر آزاد کی دو کتابیں اہم ہیں۔

۱۔ کشمیری پر اُردو کے اثرات (ایک لسانی تجزیہ ۲۰۱۲ء)

۲۔ کشمیر امکانات (تنقیدی مضامین کا مجموعہ ۲۰۱۱ء)

اس کے علاوہ نذیر آزاد نے مختلف موضوعات پر جو تحقیقی وتنقیدی مضامین لکھے ہیں ان سے کشمیر میں اُردو تحقیق وتنقید کی موجودہ صورتِ حال کو تقویت حاصل ہوئی ہے۔

جان محمد آزاد:۔ جان محمد آزاد فکشن نگار ہیں لیکن ان کی بعض تصنیفات مثلاً ''آدابِ صحافت'' اور ''جموں وکشمیر کے اُردو مصنفین''، تحقیق وتنقید کی اچھی مثالیں ہیں۔جموں وکشمیر کے اُردو مصنفین میں انہوں نے جموں وکشمیر کے ایک سوبیس اُردو قلم کاروں کے بارے میں اختصار کے ساتھ معلوماتی نوٹس (Notes) لکھے ہیں۔ان میں تحقیقی وتنقیدی عناصر تو ہیں لیکن بحیثیت مجموعی اس کتاب ''جموں کشمیر کے اُردو مصنفین'' کی حیثیت ایک معلوماتی کتاب کی ہے جس میں جموں وکشمیر کے قدیم وجدید افسانہ نگاروں، ناول نگاروں، صحافیوں، محققوں کے بارے میں اختصار کے ساتھ معلومات جمع کی گئی ہیں۔لیکن یہ معلوماتی تصنیف طلباء وطالبات کے لئے مفید ہے۔

بشیر احمد نحوی:۔ بشیر احمد نحوی کشمیر میں ایک مخلص عاشق اقبال اور خطیب کے طور پر شہرت رکھتے ہیں۔کشمیر انسٹی چیوٹ کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے انہوں نے کئی قومی اور بین الاقوامی سیمینار کروائے جن میں اقبالیات کے حوالے سے معیاری تحقیقی وتنقیدی مقالے پیش کئے گئے۔یہ مقالے بعد میں یا تو کتابی صورت میں شائع کئے گئے یا پھر اقبال انسٹی چیوٹ کے مجلّہ اقبالیات میں وقتاً فوقتاً شائع ہوئے۔بشیر احمد نحوی نے اپنے ڈائریکٹر شپ کے زمانے میں

مرغوب بانہالی، پروفیسر قدوس جاوید، حکیم منظور اور غلام رسول ملک سے اقبال پر کتابیں لکھوائیں اور خود بھی دو کتابیں لکھیں ہیں۔

۱ اقبال اور تصوف

۲ اقبال افکار واحوال

اس کے علاوہ بھی اقبال پر انہوں نے متعدد مضامین لکھے ہیں۔ تاریخ کے مطالعے سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ ہر علمی اور ادبی شخصیت کی بقائے دوام کا راز اس کے غیر معمولی کارناموں میں مضمر ہوتا ہے۔ اس لئے یہاں پر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ پروفیسر نحوی کی اقبالیات سے جو والہانہ وابستگی رہی ہے، متذکرہ بالا تاریخی فیصلے کے عین مطابق ہے کیونکہ پروفیسر نحویؔ، اقبالؔ سے کچھ اس قدر متاثر ہیں کہ مطالعۂ اقبالیات ان کے لئے روز مرہ کی غذا بن گیا ہے۔ بے شک وہ ایک پختہ کار دانشور، صاحبِ طرز ادیب اور ایک مثالی استاد کی شخصیت کے وارثِ جائز ہیں، نحویؔ، اقبالؔ کی فکر، پیغام اور روح کو عام انسان کے دل میں منتقل کرنے والی جستجو کا نام ہے۔ فکر وفن کو پیش کرنے کا، ان کا اندازِ بیان ہی کچھ ایسا انوکھا اور نرالا ہے کہ ان کی زبانی، فکر اقبال عوامی دلچسپی اور پسندیدہ موضوع بنا جاتا ہے۔

پروفیسر نحوی کو بحثیت اقبال شناس اور اقبال فہم قبولِ عام حاصل ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ علامہ اقبال کو پیش کرتے وقت خوبصورت عنوانات کے تحت ان کی زندگی، شخصیت اور فکر وفن کے پیالے، ایسے فکری پیمانے سے پلانے کی کوشش کرتے ہیں جنہیں ہر سننے والا آبِ حیات سمجھ کر پی جاتا ہے۔

مجموعی طور پروفیسر بشیر احمد نحوی جس اخلاصِ نیت کے ساتھ اقبال فہمی اور اقبال شناسی کو بانٹنے کا حق ادا کر رہے ہیں وہ یقیناً قابلِ تحسین وآفرین ہی نہیں بلکہ ملتِ اسلامیہ کے لئے باعث صد افتخار بھی ہے۔ آپ کی سربراہی میں اقبال انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام سمیناروں، مباحثوں، مذاکروں اور مشاعروں کا یہ سلسلہ جو دیکھنے کو ملتا ہے واقعی اقبالیات میں

ایک قابل قدر اضافے کی دلیل پیش کرتا ہے۔اس مستزاد یہ کہ آپ کی حوصلہ افزائی کی بدولت اب نو آموز ادیبوں اور محققوں کے متعدد مقالے بھی شعبے کے مجلّے اقبالیات میں جگہ پاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اب اقبالیات پر سنجیدہ تحقیق اور تنقید کرنے والے بے تاب نوجوان محققین بھی شعبے کے مستقبل کا دروازہ کھٹکھٹاتے نظر آتے ہیں۔

اس کے علاوہ اب تک شعبۂ اقبالیات میں پروفیسر نحویؔ کی زیر ادارت تقریباً تیس کتب وجرائد شائع ہو چکے ہیں جن میں سے درجہ ذیل قابل ذکر ہیں:۔

۱۔ اقبال ایک تذکرہ: حکیم منظور

۲۔ اقبال ایک تجزیہ۔ڈاکٹر بشیر احمد نحوی

۳۔ مطالعۂ مثنوی اسرارِ خودی۔ڈاکٹر تسکینہ فاضلؔ

۴۔ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ کے مسلم اعلام۔ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی

۵۔ وہ دانائے سبل۔ڈاکٹر ع بشیر احمد نحویؔ

۶۔ نخات اقبال۔ڈاکٹر بشیر احمد نحوی

۷۔ اقبال کا تخلیقی شعور۔حامدی کاشمیری

۸۔ رازالوند۔سید حبیب

۹۔ اقبال اور عالم عربی ودیگر مقالات۔ڈاکٹر بدرالدین بٹ

۱۰۔ جاوید نامہ۔پروفیسر سراج الدین اور اقبال کی تخلیقت۔پروفیسر قدوس جاوید

اس کے علاوہ پرفیسر بشیر احمد نحوی نے اقبالیات سے متعلق جو سیمینار منعقد کروائے ہیں وہ یہ ہیں۔

۱۔ اقبال اور معاصر نظام تعلیم ۲۰۰۰ء پرفیسر بشیر احمد نحوی

۲۔ اقبال اور تعمیر آدمیت ۲۰۰۱ء ....

۳۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد سیمینار ۲۰۰۳ء ....

الغرض کہ بشیر احمد نحوی نے کشمیر میں اُردو تحقیق وتنقید کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے اور خصوصاً جو اُنہوں نے اقبال شناسی کے فروغ میں اپنا کردار نبھایا ہے اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

اس کے علاوہ بھی اقبال پر انہوں نے متعدد مضامین لکھے ہیں۔ بشیر احمد نحوی نے کشمیر میں اُردو تحقیق وتنقید کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں جموں وکشمیر میں اُردو تحقیق وتنقید کی صورتِ حال کے منظر نامے میں اگر جموں یونی ورسٹی اور کشمیر یونیورسٹی سے وابستہ بعض اساتذہ اور اسکالرز کو بھی شامل کر لیا جائے تو بظاہر جموں وکشمیر میں تحقیقی وتنقیدی ادب لکھنے والوں کی تعداد سینکڑوں تک پہنچ جائے گی لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُردو شعر و ادب کو مثبت اور تعمیری سمت دینے والے ایسے محققین اور ناقدین کم ہیں لیکن جو ہیں ان کی کاوشوں کو برصغیر ہندوپاک کے دوسرے مراکز کے محققین اور ناقدین کی تحریروں کے بالمقابل رکھا جاسکتا ہے۔

حواشی

۱۔ بحوالہ، پریمی رومانی، فکروفن، (مرتب) اسداللہ دوانی، رچنا پبلی کیشنز ۲۰۱۱ء، ص،۳۹۔

۲۔ بحوالہ، پریمی رومانی، فکروفن، (مرتب) اسداللہ دوانی، رچنا پبلی کیشنز ۲۰۱۱ء، ص، ۴۳۔

۳۔ بحوالہ، پریمی رومانی، فکروفن، (مرتب) اسداللہ دوانی، رچنا پبلی کیشنز ۲۰۱۱ء، ص، ۴۳۔

۴۔ بحوالہ، پریمی رومانی، فکروفن، (مرتب) اسداللہ دوانی، رچنا پبلی کیشنز ۲۰۱۱ء، ص، ۴۸۔

۵۔ بحوالہ، پریمی رومانی، فکروفن، (مرتب) اسداللہ دوانی، رچنا پبلی کیشنز ۲۰۱۱ء، ص، ۴۹۔

۶۔ بحوالہ، پریمی رومانی، فکروفن، (مرتب) اسداللہ دونی، رچنا پبلی کیشنز ۲۰۱۱ء، ص، ۵۰۔

۷۔ بحوالہ، پررومانی، فکروفن، (مرتب) اسداللہ دوانی، رچنا پبلی کیشنز ۲۰۱۱ء، ص، ۵۱۔

۸۔ قدوس جاوید سے انٹرویو، از راشد عزیز، بمقام ریڈیو کشمیر، سرینگر۔

۹۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

۱۰۔ احمد علی جوہر، یونیورسل اردو پوسٹ۔کام

۱۱۔ بحوالہ، پریمی رومانی، فکروفن، (مرتب) اسداللہ دوانی، رچنا پبلی کیشنز ۲۰۱۱ء، ص، ۵۱۔

۱۲۔ پروفیسر ضیاءالدین، اطرافِ تنقید، ناشر، سیمانت پرکاش دہلی ۲۰۰۶ء، ص، ۸۸۔

۱۳۔ پروفیسر عبیدالرحمٰن ہاشمی، بحوالہ، مشتاق احمد وانی، تقسیم کے بعد اُردو ناول میں تہذیبی بحران، ناشر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۲۰۰۲ء، ص،۱۳۔

۱۴۔ مشتاق احمد وانی، تقسیم کے بعد اُردو ناول میں تہذیبی بحران، ناشر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۰۲ء ص، ۱۵۸۔

۱۵۔ مشتاق احمد وانی، اُردو ادب میں تانیثیت، ناشر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۱۳ء، ص ۱۴۔

۱۶۔ نصرت چودھری، فیض احمد فیض، روایت اور انفرادیت، ناشر، سیمانت پرکاش نئی دہلی، ۱۹۹۵ء، ص، ۳۳۳۔

۱۷۔ نصرت چودھری، فیض احمد فیض، روایت اور انفرادیت، ناشر، سیمانت پرکاش نئی دہلی ۱۹۹۵ء، ص، ۳۱۳۔

۱۸۔ ڈاکٹر ریاض احمد، ترقی پسند اُردو تحریک اور اُردو ناول، ناشر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی،

۱۹۔ مجید مضمر پروفیسر، اردو کا علامتی افسانہ، ص ۱۰۔

۲۰۔ ایضاً ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ص ۱۵، ۱۶۔

۲۱۔ حامدی کاشمیری پروفیسر، دیباچہ، اردو کا علامتی افسانہ، ص ۷۔





تحقیق کے دوران ظاہر ہے رہنمائی ناگزیر ہوتی ہے ورنہ اسکالر الجھ کر رہ جاتا ہے۔ چنانچہ لیاقت علی کو دوران تحقیق اس کے اہداف ومقاصد کے تناظر میں میری رہنمائی حاصل رہی ہے۔ لیاقت علی پڑھنے لکھنے میں مشغول، انسان شعور، خوش مزاج، ملنسار اور ایک باصلاحیت اسکالر ہیں۔ خاص طور پر جموں وکشمیر کے اردو ادب سے ان کی دلچسپی اور گہری نظر ہے۔ ان کے متعدد علمی کارنامے ہندوپاک کے رسائل وجرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں جن کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

ریاست جموں وکشمیر نہ صرف اردو زبان وادب بلکہ برصغیر ہندوپاک کی تاریخ میں ایک سیاسی اور سماجی تاریخ کی حامل ہے، یہاں متعدد موضوعات آئے دن جنم لیتے ہیں۔ ادب چونکہ موضوعات کا بھوکا ہوتا ہے تاہم ہر نیا موضوع اپنے آپ میں ایک تاریخ بیان کرتا ہے۔ اس موقع پر بہترین اور بدترین ادب کی پہچان یا تقسیم کرنا مشکل امر ہے اور یہاں جس استدلالی ذہن، ژرف نگاہی اور احتیاط وصبر کی ضرورت تھی لیاقت علی نے اس کا ثبوت دیا ہے۔ لیاقت علی کی زیر نظر کتاب ''جموں وکشمیر میں اردو ادب ۲۰۰۰ تا ۲۰۱۳ء'' میں ریاستی ادب کی ایک دہائی تاریخ کو ہی قلم بند نہیں کیا گیا بلکہ مشہور تصنیفات کا تجزیہ کر کے عملی تحقیق کے اعلیٰ نمونے بھی پیش کئے گئے ہیں۔ یہ ایک ایسا ایثار ہے جس کی مثال فی زمانہ ملنی مشکل ہے۔

علم وادب کی دنیا میں وہی اسکالر کامیاب ہوسکتا ہے جس کے ہاں تعمیر کا جذبہ ہو، جو اپنی صلاحیتوں اور مہارتوں کی نشوونما کے تئیں مخلص ہو، غیر جانبدار ہو، کشادہ ظرف، وسیع النظر اور مثبت طرز فکر رکھتا ہو۔ لیاقت علی کی ابتدائی کوشش ان صفات وجدوجہد سے عبارت ہے۔ حرکت وتحریک ان کی سرگرمیوں سے عیاں ہے۔ اس معیاری کام کی تعمیر کے لئے مبارک کے مستحق ہیں۔

پروفیسر شہاب عنایت ملک

صدر، شعبہ اردو جموں یونیورسٹی، جموں وکشمیر



M. R. Publications

Printers, Publishers, Suppliers & Distributors of Literary Books

10 Metropole Market, 2724-25 First Floor
Kucha Chelan, Daryaganj, New Delhi-110002
Cell: 09810784549, 09873156910 E-mail: abdus26@hotmail.com

